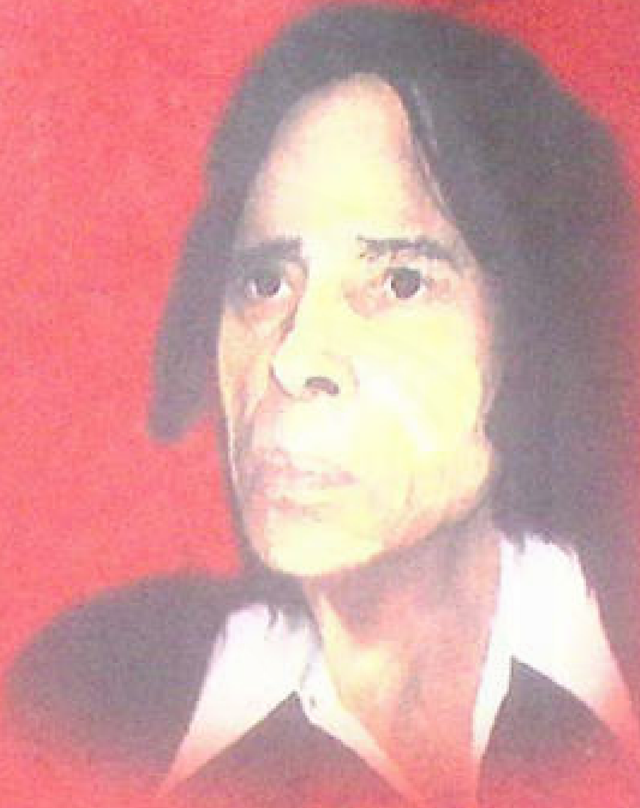


جون ایلیا—
خوش گزراں گزر گئے

ترتیب و انتخاب

نسیم سیّد

نسیم سیّد | جون ایلیا — خوش گزراں گزر گئے

جون ایلیا —

خوش گزراں گزر گئے

ترتیب و انتخاب

نسیم سیّد

اکادمی بازیافت

پہلی اشاعت : جنوری 2011
کمپوزنگ : لیزر ٹیکس، فون: 32751324
قیمت : 300 روپے
25 ڈالر

Jaun Ailia—Khushguzaran
Guzar Gaey
(Critical Study)
By: Naseem Syed

Kitab Market, Office# 17, St.# 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 32751428
e-mail: a.bazyafl@yahoo.com

جون بھائی

کے نام

فہرست

○

نوشتۂ دیوار

جون بھائی کے حوالے سے کچھ لکھتے ہوئے نہ جانے کیوں جی کرتا ہے پوچھوں موئن جو دڑو کے کھنڈرات تم بتاؤ:

جب سانس لیتی روشنیاں، گلاب آوازیں، شاداں گلیاں، لہلہاتے کھیت اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت خود میں دفن ہو جاتے ہیں—— تو کیسا لگتا ہے؟

جون ایلیا بھی تو ایک آباد شہر تھا—— بڑی زندہ روشنیوں اور آوازوں والا۔ اس کے ہر موڑ پر تاریخ اپنی شہادتیں نصب کرتی تھی۔ اس کے ہر در پر علم کے پھریرے لہراتے تھے۔ یہ پھریرے منطق کے دبیز استر میں باوزن، عشق کے سبز رنگوں میں شاداب نہ جانے کتنی برکتیں گلی گلی رقم کرتے اگر یہ شہر اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت خود میں دفن نہ ہو گیا ہوتا۔ وہ گم ہو گیا، یہ اس کا فیصلہ رہا ہوگا مگر وقت کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے—— پوچھ لیں موئن جو دڑو سے—— زمین کو اگلنا پڑتا ہے عظیم نشانیوں کو واپس۔ ہواؤں کو وقت کا حکم ماننا پڑتا ہے اور ساری گرد، مٹی، خاک سب صاف کرنی پڑتی ہے اسے ان زندہ دفن ہو جانے والی آبادیوں پر سے۔ ہم اپنی انگلیوں سے زمیں کھود رہے ہیں، پورا شہر ڈھونڈنا ہے۔ یہ تو صرف چند

گلیاں ہیں، چند موڑ ہیں، اس شہر کے جن کی چند بے بساط انگلیوں نے نشان دہی کی ہے۔
معلوم نہیں، میری سوچ کدھر نکلی جا رہی ہے۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو بہت دیر تک کرتے رہنے کو جی کرتا ہے مگر... مجھے تو وہ لکھنا ہے جو لکھنا بہت مشکل ہے۔
میری طرح شاید ہی کسی کو وقت پیش آئی ہو، اپنے احساسِ ممنونیت کے اظہار میں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میں تو بال بال سے مقروض ہوں اور وہ بھی کیسی کیسی ہستیوں کی۔ میرے عزیز اور محترم دوست سحر انصاری، جناب رضی مجتبیٰ صاحب اور عنبریں سے میری طرف سے مبین مرزا نے درخواست کی اور قبول بھی ہوئی۔ کیسا افتخار ہے ایسی بے ساختہ دعا کا قبول ہو جانا اور کیسا عجب حوصلہ ہے مبین مرزا کی دوستی بھی —— انھوں نے کہہ دیا کہ کتاب آ جائے گی تو بس معلوم تھا کہ ایک مہینے سے بھی کم وقت میں آ جائے گی، تو کتاب آ گئی۔ مبین! بھئی الفاظ نہیں ہیں، سو، بس آپ خود ہی سمجھ لیں کہ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔
سعود عثمانی صاحب بے حد مصروف تھے مگر میری درخواست پر نہ صرف خود مضمون لکھا بلکہ کسی طرح سلیم کوثر صاحب کو بھی ڈھونڈ کے ان کا خوب صورت مضمون حاصل کیا۔ الفاظ میں شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں سعود صاحب کہ حسابِ دوستاں در دل والی بات ہے۔
سلیم کوثر صاحب بہت ممنون ہوں۔
اپنے بھائی جیسے دوست فرحت شہزاد کو بس کہہ دیا کہ لکھنا ہے۔ اپنی محبتوں کا بس ایسا ہی حساب کتاب ہے۔
دوست محمد خان صاحب کی والدہ کو شاید معلوم تھا کہ ان کا سپوت کس خصلت کا ہوگا، سو دوست نام رکھ دیا۔ دوستی کے نام پر کوئی مشکل ان کے لیے مشکل نہیں۔ مجسم سپاس ہوں دوست محمد خان صاحب، عرفان ستار صاحب۔ اقبال حیدر صاحب اور شائستہ رضوی صاحبہ ٹھہرے جون بھائی کے خاص رشتے دار —— جون بھائی ان کا ماتھا چومیں گے اور مسکرائیں گے۔

ابو حمزہ جس کمال کے آرٹسٹ ہیں، ویسے ہی کمال کے ادب نواز۔ یہ دعوت نامہ ان کی جون بھائی سے محبت کا خوب صورت ثبوت ہے، اور یادگار کے طور پر کتاب میں شامل۔

تم نے سنا علی زریون! ابھی جون بھائی نے کیا کہا؟

''تم آ گئے! تم نے بہت انتظار کرایا۔ تمھاری ایک امانت میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہ میرے خام اور نا تمام لفظ ہیں۔ یعنی میرے اشعار...وہ اشعار جو میں کہہ نہیں سکا۔''

اس کتاب میں موجود نام میری ''المدد'' کی ایک صدا پر لبیک کہنے والی وہ آوازیں ہیں جو ادب کے قریب مصلحت کو پھٹکنے بھی نہیں دیتیں— ایسی آوازوں کا میں نہیں مانتی کہ کال ہے، بلکہ بے شمار ہیں۔ ان میں سے چند ایسی محترم اتنی مکرم ہستیوں کے الفاظ کا یوں میسر آ جانا بھی شاید وقت کا ہی فیصلہ ہے۔ میں اس احساسِ ممنونیت کو جون بھائی کے الفاظ پر ہی ختم کرنا چاہتی ہوں۔

''وہ آ رہے ہیں، میں ان آنے والوں کے پہلے پرے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ان آنے والوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا، ان کے ماتھے چومتا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا ہوں۔''

جونِ بھائی کے الفاظ نوشتۂ دیوار ہیں۔

ان آنے والوں کے پہلے پرے کو میں تعظیم پیش کرتی ہوں۔

نسیم سیّد

خیال کی خوشبو — جون ایلیا

میرے والد مقبول احمد چشتی کے مراسم مراد آباد اور امروہہ کی نسبت سے رئیس امروہوی سے دیرینہ تھے۔ پاکستان آنے کے بعد ملاقاتوں کے زیادہ مواقع میسر آتے رہے۔ ۵۶،۱۹۵۵ء میں، جب میں کالج کا طالبِ علم تھا اور شاعری کا بھی کچھ نہ کچھ سلسلہ جاری تھا، میرے والد نے رئیس صاحب سے میرے ادبی رجحانات کا تذکرہ کیا اور پھر رئیس صاحب کے دفتر ''شیراز'' میں ملاقات کی غرض سے لے گئے۔ رئیس صاحب اُس وقت کھارادر کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے جہاں سے اُن کا دفتر پندرہ، بیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ مجھ سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آنے لگے، یہاں تک کہ میں رفتہ رفتہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے میں اُن کے خاندان کا ایک فرد ہوں۔ ایک ملاقات میں اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ چند دن بعد میرے سب سے چھوٹے بھائی جون ایلیا امروہہ سے آ رہے ہیں۔ وہ بہت اچھے شاعر ہیں اور آپ اُن سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ اُس وقت تک میں چاروں بھائیوں اور اُن کی عرفیت سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ بھائی رئیس اچھن تھے، سیّد محمد تقی چھمن تھے، بھائی عباس بچھن اور جون تو جون ہی

رہے۔ خاندان کے بچوں نے اُن پر ایک شعر بنا رکھا تھا جو وہ کورس کے انداز میں کبھی کبھی پڑھا کرتے تھے:

اچھن، چھبن، بچھن، جون
ان چاروں میں اچھا کون؟

ایک دن سہ پہر کے وقت میں ''شیراز'' کے دفتر میں بھائی رئیس کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک جوان العمر شخص دفتر میں داخل ہوا۔ بھائی رئیس نے کہا، ''آؤ بھئی جون آؤ، اچھے آئے۔ ان سے ملو، یہ نئی نسل کے اچھے شاعر ہیں سحر انصاری۔ ان کے ابا کا تعلق بھی مرادآباد اور امروہے سے رہا ہے۔''

جون ایلیا دفتر میں کھڑے تھے، میں نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور گلے ملنے کے بعد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ جون ایلیا ململ کے کرتے پاجامے میں ملبوس ہیں، گرمی کا موسم تھا لیکن وہ شانوں پر کمبل ڈالے ہوئے تھے اور پیروں میں کھڑاویں تھیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ کھارادر سے اسی طرح کھڑاؤں پہنے چلے آئے۔ کچھ دیر کے بعد یہ راز کھلا کہ وہ یونانی فلسفیوں سے بہت متاثر ہیں اور اپنی وضع قطع میں فیشن وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔

جون ایلیا سے پہلی ہی ملاقات میں ذہنی وقلبی قربت کا احساس ہوا۔ انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں بتا دیا کہ مجھے پہلوانی کا شوق رہا ہے۔ اکھاڑے میں ورزشیں بھی کی ہیں اور ڈراموں میں بھی اداکاری کی ہے۔ اس وقت کے پرانے دوستوں میں وہ ''ظہیر نفسی'' کا نام لیتے تھے جو نفسیات کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ امروہہ سے آتے وقت اچھے خاصے افراد ٹرین پر سوار کرانے آئے تھے اور اُن کے لیے اُن کے استاد نے عربی میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔

جون اس وقت بھی دُبلے پتلے اور کم زور نظر آتے تھے۔ بڑے فخر سے یہ

سناتے تھے، ''بھائی سحر! میں ٹی بی میں مبتلا رہا ہوں، خون تھوکتا رہا ہوں۔'' اسی طرح اُس وقت کی نظموں میں ''فارہہ'' کے نام نظمیں بھی سنائیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ گلے تک ایک رومان پسند شاعر ہیں جس کے آئیڈیل جون کیٹس اور مجازؔ ہیں۔ اسی اثنا میں ہمارے حلقۂ احباب میں انجم اعظمی، قمر ہاشمی، محمد علی صدیقی، س م صولت اور رسول احمد کلیمی شامل ہو گئے جنھوں نے اس وقت ندیم انصاری کے قلمی نام سے لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ ''شیراز'' کے دفتر میں ملاقاتیں ہوتی رہیں پھر جون ایلیا کے لیے معروفیت کا ایک شعبہ بھائی رئیس اور بھائی تقی نے یہ تلاش کیا کہ ''انشا'' کے نام سے ایک ماہنامے کا اجرا کر دیا گیا جس کے مدیر جون ایلیا تھے۔ اس رسالے سے میری وابستگی بھی بہت رہی۔ اُسی میں جون ایلیا نے میرے مختصر حالات، تصویر اور کلام شائع کیا۔ پھر میں کئی برس تک کراچی کی ادبی نشستوں کا حال ''نشستند و گفتند و برخاستند'' کے عنوان سے لکھتا رہا۔ ان تحریروں کو اگر یکجا کر دیا جائے تو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں کراچی کی ادبی فضا اور سرگرمیوں کا ایک مجموعی مرقع سامنے آسکتا ہے۔

جون ایلیا کو اب اُن کی فلسفیانہ وضع قطع سے الگ کر لیا گیا اور ہم سب نے جدید فیشن کے سوٹ سلوائے اور اب ایک نئے طرز کے ادبی ماحول کو نکھارنے میں مصروف ہو گئے۔ جون ایلیا بعض جدتوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے، مثلاً میں نے ایک دن ایک خط انھیں لکھا اور لفافے پر نام اور پتا یوں درج کیا:

حضرت جون ایلیا صاحب

سردبیر مجلّہ انشا

بنگ اسبنڈ روڈ، کھارادر

بہت خوش ہوئے۔ اس طرح کی تبدیلیوں سے اُن کے مزاج میں شگفتگی آتی گئی اور ہنسنے بولنے اور اچھے فقرے کہنے اور سننے کا ایک ماحول بننے لگا۔ اُسی زمانے میں اردو ڈکشنری

بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ جوشؔ ملیح آبادی اس کے مدیرِ اعلیٰ اور شان الحق حقی بورڈ کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ دیگر حضرات میں نسیم امروہوی، حمید الدین شاہد، زکریا مائل، قدرت نقوی عملے میں شامل تھے۔

طے یہ پایا کہ یہ بڑی لغت پہلے سے موجود لغات کے ذریعے تیار نہیں کی جائے گی بلکہ قدیم ترین اردو مخطوطات اور مطبوعات سے لے کر دورِ حاضر تک کے اصل متون پڑھے جائیں گے۔ اُن کا تاریخی تسلسل، اسناد اور حوالوں کے ساتھ پیش کیا جائے گا اور تشریحات مدیران لکھیں گے۔ چناں چہ اس زمانے میں بھائی رئیس، بھائی تقی، بھائی جون اور میں کتابوں کے متون پڑھنے اور اسناد کے کارڈ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہی زمانہ تھا جب بھائی رئیس کا خاندان کھارادر سے منتقل ہو کر خوجہ جماعت خانہ (گارڈن ایسٹ) کی ایک کوٹھی میں سکونت پذیر ہو گیا۔ اس میں کئی اضافے ہوئے، مثلاً انشا کے دفتر کے ساتھ ساتھ بھائی تقی نے ''مشرق'' کے نام سے ایک پریس قائم کر دیا۔ اس کوٹھی میں ایک بڑا لان بھی تھا جہاں شام کو ایسی محفلیں جمتی تھیں جو واقعی یادگار تھیں۔ جوشؔ ملیح آبادی، جی الانہ جیسے بزرگوں سے لے کر عام نوجوان ادیب، شاعر اور طلبہ بھی شریک ہو جاتے تھے۔ ویسے تو پوری کوٹھی پر جون ایلیا کا بھی تصرف تھا لیکن انھوں نے اپنی خواب گاہ کے طور پر ایک چھوٹا سا کمرہ منتخب کر لیا تھا جسے وہ حجرہ کہتے تھے۔ اس حجرے میں بھی بہت یادگار نشستیں ہوئیں۔

ادبی رسالے کسی زمانے میں بھی منافع بخش نہیں رہے۔ پھر وہ زمانہ تو ایوب خاں کے مارشل لا اور آمریت سے عبارت تھا جو بالآخر ۱۹۷۱ء کے سقوطِ ڈھاکا پر منتج ہوا اور مشرقی پاکستان سے سابق پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد بے سروسامانی کے عالم میں آنے لگی۔ حالات و مسائل کے پیشِ نظر ''انشا'' کو ادبی پرچے کے ساتھ ساتھ ایک ڈائجسٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ مالی مشکلات کے سبب جون ایلیا نے کچھ مدت ڈکشنری

بورڈ میں، انجمنِ ترقیِ اردو میں اور پھر اسماعیلی ایسوسی ایشن میں ملازمت کر لی لیکن اُن کی تلون مزاجی کسی جگہ بھی مطمئن نہ ہوئی۔

۱۹۶۶ء میں میری شادی خیر النسا سے ہوئی۔ بھائی رئیس کے خانوادے نے اس میں بھرپور دل چسپی لی۔ یہاں تک کہ بھائی رئیس کی شیروانی ہی میں مجھے دولھا بنایا گیا اور ہم جب نکاح کے لیے اپنے سسرالی مکان پر پہنچے تو چند ایک قریبی عزیزوں کے علاوہ بھائی رئیس، بھائی تقی، بھائی جون، محمد علی صدیقی، ممتاز سعید، شفیق حسن زیدی، انجم اعظمی، خلیل صدیقی اور پیار علی الانہ اُس میں شریک ہوئے۔ شادی کی تقریب پر اُس وقت ایک ادبی نشست کا گمان ہو رہا تھا۔ چند دوستوں نے بھائی رئیس سے فرمائش کی کہ اس موقع کی مناسبت سے کچھ قطعات تو فرمایئے۔ بھائی رئیس نے فارسی اور اردو میں فی البدیہہ تاریخی قطعات کہنے شروع کر دیے۔ اب شادی کے گھر میں کاغذ کس سے مانگا جائے؟ چناں چہ دوستوں نے جیبوں سے نئے نئے نوٹ نکالے اور انھیں پر قطعات لکھواتے گئے۔ بھائی رئیس اس شادی سے بہت خوش ہوئے۔ اپنی قیام گاہ پر ہمارے لیے پُرتکلف دعوت کا اہتمام بھی کیا۔ اس کے بعد وہ کہا کرتے تھے، ”بھائی! اب جون کو بھی شادی کر لینی چاہیے، مگر میں ڈرتا ہوں کہ جون نبھا بھی سکیں گے کہ نہیں۔“ اس تبصرے پر جون ایلیا قدرے جھنجلا کر مجھ سے کہتے ”بھائی سحر! میں کتنی شادیاں کر کے چھوڑ چکا ہوں جو بھائی کو میری طرف سے یہ اندیشہ لاحق ہے۔“

پھر یوں ہوا کہ جون ایلیا، زاہدہ حنا کے حق میں دلیلیں دینے لگے۔ زاہدہ اُس وقت اپنے والدین کے ساتھ جوبلی سینما کے علاقے میں ایک فلیٹ میں رہتی تھیں۔ شادی سے قبل میں بھی کئی بار بھائی جون کے ساتھ زاہدہ سے ملا۔ بھائی جون کے مزاج میں وہی تذبذب، بے یقینی اور تشکیک جاگزیں تھی جو آخر دم تک اُن کے ساتھ رہی۔ چناں چہ زاہدہ کے بارے میں کبھی کوئی رائے دیتے، کبھی کچھ اور۔ لیکن میں نے ہمیشہ انھیں اس

صورتِ حال کو بہتر شکل دینے اور زاہدہ حنا کو شریکِ حیات کے طور پر اپنانے کے حق میں دلیلیں دیں۔ بہرحال شادی کے بعد وہ بہت خوش رہے۔ میں نے خود دیکھا کہ زاہدہ، جون ایلیا کو صبح تیار کرواتیں اور بچوں کی طرح اُن کے بال سنوارتیں اور خود کار ڈرائیو کر کے انھیں، اُن کے دفتر پہنچاتیں۔

بھائی جون کی شاعری مقبولیت حاصل کرتی رہی، مشاعروں میں انھیں ذوق و شوق سے سنا جاتا۔ اُس وقت کے شاعروں میں حمایت علی شاعر، حبیب جالب، خالد علیگ، جون ایلیا، محسن بھوپالی بطور خاص مشاعروں میں سنے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں جون کے چند قطعات اور نظم "دو آوازیں" بہت مقبول ہوئی۔ ان مشاعروں میں جو لوگ شریک ہوتے تھے، اُن میں ادیب اور شاعر بھی تھے، سیاسی لیڈر بھی اور طالب علم رہنما بھی۔

بھائی جون کبھی کبھی بہت جدید بن جاتے تھے اور کبھی بہت روایتی، مثلاً کھانے میں مونگ کی کھچڑی، پودینے کی چٹنی یا اڑد گوشت کی فرمائش کرتے۔ ایک دن موڈ ہوا کہ "سحر بھائی! ہری مرچوں والا قیمہ کھائیں گے اور میں پکاؤں گا۔"

میں نے اپنی اور اپنے بھائیوں کی پڑھائی کے لیے ایک علاحدہ مکان لے رکھا تھا۔ وقتِ مقررہ پر بھائی جون، انجم اعظمی، س م صولت اور میرے محلے کے دوست خلیل صدیقی یک جا ہو گئے۔ سب مل کر گوشت مارکیٹ روانہ ہوئے تو پتا چلا کہ آج گوشت کا ناغہ ہے، پھر بھی قصائی سے پوچھا کہ "بھائی اگلے دن کے لیے گوشت کب آئے گا؟"

اُس نے دو ڈھائی بجے رات کا وقت بتایا۔ اس اثنا میں تندوری پراٹھے پکانے کے لیے گھی اور آٹا بھی تندور والے کو دے آئے تھے۔ بمشکل رات کو دو، ڈھائی بجے ہم پھر مارکیٹ پہنچے۔ قصائی نے کہا، "بھائی اس طرح گوشت تھوڑی بکتا ہے۔ اس کو ابھی دھوئیں گے، صاف کریں گے، اس کے الگ الگ حصے کریں گے، پھر آپ کو آپ کے مطلب کا قیمہ دیں گے۔" اس وقت بھائی جون کی بے چینی اور بے بسی دیدنی تھی۔ خدا

خدا کر کے سب سامان لے کر گھر پہنچے۔ پکانے کے دوران ہنسی مذاق اور فقرے بازی بھی چلتی رہی، آخر بھائی جون نے یہ مژدہ سنایا کہ قیمہ تیار ہو گیا ہے۔ اس وقت صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ پھر جو لطف اُس وقت کے کھانے میں سب کو محسوس ہوا، اُس کا بیان ممکن نہیں۔

بھائی جون اکثر ایسی باتیں مشہور کروانا چاہتے تھے جو حلقوں میں پھیلیں اور لوگ اُن پر تبصرے کریں۔ وہ کہتے تھے، ''زندگی کے واقعات مجاز کی طرح عام ہونے چاہییں۔'' انھیں متضاد اور عجوبہ فقرے یا باتیں کرنے میں بھی ایک خاص لطف آتا تھا مثلاً وہ کسی خاتون یا مرد کے بارے میں یہ کہہ دیتے تھے، ''اس کے ساتھ میں ساری زندگی گزار سکتا ہوں لیکن تین گھنٹے نہیں رہ سکتا۔''

واقعات تو بہت سے ہیں لیکن چند ایک کا ذکر مناسب رہے گا۔ ہمیں ایک بار امریکا اور کینیڈا مدعو کیا گیا۔ میزبانوں میں اشفاق حسین، نسیم سید، اطہر رضوی، شاہین، اکرام بریلوی، ظفر، اقبال حیدر اور دیگر احباب شامل تھے۔ مدعوئین میں احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، محسن احسان اور اُن کی بیگم ثروت، پروفیسر فتح محمد ملک، جون ایلیا اور میرا نام شامل تھا۔ کراچی سے طیارے میں بیٹھنے کے بعد جون ایلیا نے کہا، ''بھائی سحر! میں آپ کی سیٹ کے ساتھ برابر ہی بیٹھوں گا اور تین ماہ تک پورے سفر میں پچ بٹن کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہوں گا۔'' ہم جب نیویارک ایئرپورٹ پر اُترے تو ایک کھڑکی پر میں اور بھائی جون اپنے اپنے پاسپورٹ پر مہریں لگوانے پہنچ گئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے امریکی نے جون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا، ''Is she your wife?''، میں نے ہنس کر جواب دیا، ''No! he is my male friend.''، ہم حیران ہوئے کہ اس سوال کی کیا تُک تھی؟ پتا چلا کہ اپنے دُبلے پتلے جسم، کھڑے ناک نقشے اور لمبے بالوں کی وجہ سے وہ میکسیکو کی کوئی خاتون معلوم ہو رہے تھے، اُس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے جو لانگ کوٹ پہن رکھا تھا، وہ زنانہ تھا جس کے بٹن دیکھ کر ہی اُسے شبہ ہوا تھا کہ وہ کوئی

خاتون ہیں۔ میں نے اس تبصرے اور تجربے کا کسی سے ذکر نہیں کیا لیکن جب میں نے دیکھا کہ بھائی جون سب کو مزے لے لے کر خود یہ واقعہ سنا رہے ہیں تو میں نے بھی احتیاط کرنی چھوڑ دی۔

امریکا پہنچ کر انھیں ''لال پری'' سے کچھ زیادہ ہی عشق ہوگیا، یہاں تک کہ کھانے پر بھی توجہ ختم ہوگئی۔ ایک اچھی دعوت کا اہتمام نیویارک کے ''روز ویلٹ ہوٹل'' میں ہوا، وہاں بھی ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد جون نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ نسیم سیّد کے اصرار پر کہتے رہے، ''تیری جان کی قسم! میں کھا لوں گا، بھوکا نہیں رہوں گا۔'' جب ہوٹل سے سب لوگ باہر نکلے تو جون بھائی نے اپنے لانگ کوٹ کی جیب سے ایک ٹشو پیپر نکالا جس میں ایک سیخ کباب لپٹا ہوا تھا۔ نسیم سیّد کو دکھا کر بولے، ''دیکھ! اب یہ میں کھا لوں گا۔''

یہ سفر ہر اعتبار سے بہت یادگار رہا۔ نیوجرسی میں میری بہن نجمہ اور بہنوئی عرفان رہتے ہیں، وہ روزانہ ہمیں کار میں بٹھا کر نیویارک پہنچا دیتے اور شام کو سیر سپاٹے کے بعد ہم واپس ہوجاتے۔ نیوجرسی ہی میں زرّین یاسین اور یاسین زبیری تھے جنھوں نے بڑی محبت سے ہمیں اپنے گھر میں رکھا۔ صبیحہ صبا امریکا کی ادبی فضا میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہیں، وہ واحد لڑکی تھی جو ہمارے لڑکوں کے اسکول میں داخل ہوئی تھی۔ اُن کے شوہر عبدالحئی میرے ہم جماعت تھے۔ ہم جب نیویارک سے مشاعرے میں شرکت کے لیے ''کارنیل یونی ورسٹی'' گئے تو عبدالحئی نے ہی کار چلانے کا ذمہ لے رکھا تھا۔ حمیرا رحمان، وکیل انصاری، حنیف اخگر، سعید وارثی یہ سب بڑے خلوص سے پیش آتے رہے۔ نیویارک سے ہم لاس اینجلس اور شکاگو بھی گئے، وہاں شمیم آرٹسٹ اور اُن کی بیگم ڈولی سے ملاقات ہوئی۔ فارغ بخاری کے بیٹے ظفر عباس نے ایل اے میں مشاعرے کا انتظام کیا۔ ہم لوگ ہائی وڈ بھی گئے اور خواجہ خالد اور اُن کی بیگم کی بدولت لاس ویگاس کا بھی دورہ کرلیا۔

شکاگو سے کینیڈا آتے ہوئے نہ معلوم کیوں رینڈم چیکنگ کے لیے جون ایلیا کو روک لیا گیا۔ فلائٹ کے جانے میں چند منٹ رہ گئے۔ ہم نے بھائی جون اور اپنے سامان کو مقامی میزبانوں کے سپرد کیا اور ٹورنٹو پہنچ گئے۔ بعد میں بھائی جون بھی آن ملے۔ یہاں ہم نے عام مشاعروں کے علاوہ اطہر رضوی کا وہ مشاعرہ بھی پڑھا جو وہ ہر سال غالبؔ کی یاد میں غالبؔ کے مصرعِ طرح پر منعقد کرتے ہیں۔ پھر ہم کیلگری گئے جہاں اقبال حیدر اور اُن کے اہلِ خانہ نے بہت محبت اور خلوص سے ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھا۔ ہمارے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس بھی ہندوستان سے آ گئے تھے۔ اُس وقت کیلگری میں برف پڑ رہی تھی اور درجۂ حرارت منفی ۳۵ ڈگری تھا۔ ہر چیز منجمد نظر آتی تھی لیکن گھروں، دفتروں اور بازاروں میں heating کا اس قدر معقول انتظام تھا کہ گھر میں تو عام پینٹ شرٹ میں ہی گزارا ہو رہا تھا۔

وہاں شہزاد احمد اور جون ایلیا ایک کمرے میں سوتے تھے۔ بھائی جون ہر صبح (جو بھائی جون کے لیے وہاں کے وقت کے مطابق عموماً بارہ، ایک بجے دوپہر کو ہوتی تھی) کھانے کی میز پر کہتے تھے، ''بھائی میں گزشتہ چھ مہینوں سے نہیں سویا۔'' اور فوراً ہی شہزاد احمد کہتے، ''تو یہ رات بھر خراٹے لے کر میری نیند کون حرام کرتا ہے؟''

ہمارے قیامِ امریکا کے دوران پروین شاکر ''ہارورڈ یونی ورسٹی'' میں سرکاری بنیاد پر ریسرچ کا کوئی کورس مکمل کر رہی تھیں۔ انھوں نے ہمیں لنچ پر مدعو کیا۔ احمد ندیم قاسمی، فتح محمد ملک، محسن احسان، شہزاد احمد، جون ایلیا اور میں دو الگ الگ کاروں میں روانہ ہوئے۔ ہم یاسمین زبیری کی گاڑی میں تھے اور راستے میں خوب لطیفے بازی اور اشعار کی پیروڈی چلتی رہی۔ قاسمی صاحب کا مصرع دیا گیا:

میں نے تو دیا بجھا دیا ہے

خوب طبع آزمائی ہوئی۔ بھائی جون کو شہزاد احمد کا یہ مطلع بہت پسند آیا۔

اے جون! یہ تُو نے کیا کیا ہے
تُو نے مجھے ایلیا دیا ہے

اپنے خاص انداز میں آنکھیں مٹکا کر کہا، "واہ بھئی شہزاد! یہ نیا لفظ دیا تم نے اردو کو ایلیانہ۔"

جب ہم "اوٹ وا" پہنچے تو مشہور شاعر ولی عالم شاہین کے یہاں قیام کیا۔ شاہین اور اُن کی بیگم نے اپنے بچوں سمیت زندگی کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اور شاہین وہاں کی سماجی اور ادبی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انھی کی وجہ سے اوٹ وا کے پارلیمنٹ ہاؤس میں اردو کا پہلا مشاعرہ ہوا۔ صدارت احمد ندیم قاسمی نے کی، نظامت میرے سپرد کی گئی۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ خیرسگالی کے طور پر کینیڈین اراکینِ پارلیمنٹ بھی سامعین میں شامل تھے۔ پھر ہمارا قیام "ونی پیگ" میں ہوا جہاں عرفانہ عزیز اور اُن کے شوہر پروفیسر ریاض احمد کئی سال سے مقیم تھے۔ اُس وقت تک جون ایلیا کا پہلا شعری مجموعہ "شاید" شائع ہو چکا تھا۔ کئی حلقوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ جون ایلیا کے دیباچے کو بطورِ خاص سراہا۔

ہم کینیڈا سے دوبارہ شکاگو گئے اور وہاں افتخار نسیم کے مہمان ہوئے۔ اُس وقت ہم تین ہی اس سفر میں ساتھ تھے۔ میں، شہزاد احمد اور جون ایلیا۔ خوب سیر تفریح ہوئی، ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں مظفر الدین فاروقی اور حبیب انصاری نے بھی خصوصی حصہ لیا۔ اُس زمانے میں ہندوستان کے سفیرِ امریکا عابد حسین تھے اور پاکستان کی سفیر عابدہ حسین۔ چناں چہ تقاریر میں امریکی روایت کے مطابق جب "ایمبیسیڈر حسین" کہا جاتا تھا تو یہ سمجھنے میں ذرا دیر لگتی تھی کہ عابد کا ذکر ہے یا عابدہ کا۔

افتخار نسیم جنھیں سب "افتی" کہتے ہیں، شکاگو کی سماجی زندگی میں بہت دخیل اور مقبول ہیں۔ سماجی کاموں میں ایڈز کے مریضوں کو بطورِ خاص امداد پہنچانے کا کام کرتے ہی۔ وہ شکاگو لیک کے قریب تینتالیسویں منزل پر رہتے ہیں اور کاروں کی ایک بڑی فرم

میں ملازم ہیں۔ اُن کے یہاں ہم نے خوب بے سلیقگی اور بے ہنگم قسم کے شب و روز گزارے۔ برتن دُھلے بغیر سینک میں پڑے ہیں، مونگ پھلی اور اخروٹ کے چھلکے جابجا بکھرے ہیں، جوتے کہیں، موزے کہیں، بستر کے کمبل اور چادر گڈمڈ ہوتے ہوئے عجب سماں پیش کرتے تھے۔ افتی نے ایک معمر یورپی خاتون کو گھر کی صفائی کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ جو اتوار کے دن گھر کی صفائی کرنے آتی تھی۔ اُس نے گھر کو تتر بتر دیکھ کر حیرت کے عالم میں جون ایلیا کی طرف دیکھا اور افتی سے کہا:

"You have made a mess of everything."

"Who are they?"

افتی نے جواب دیا:

"Poets and writers."

بڑھیا نے منہ بسور کر کہا:

"Oh! they are the same all over the world."

پاکستان کے علاوہ دُبئی، ابوظہبی اور دوحہ (قطر) کے مشاعروں میں بھی جون ایلیا کا ساتھ رہا۔ ہر جگہ وہ بہت توجہ اور دل چسپی سے سنے جاتے تھے اور مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ تاہم رفتہ رفتہ شعر خوانی کے ساتھ ساتھ اپنی باڈی لینگویج سے بھی خاصا کام لینے لگے تھے۔ جس میں عینک اُتار کر پھینک دینے اور اپنے یا اپنے برابر بیٹھے ہوئے شاعر کے زانو پر ہاتھ مارتے رہنا بھی شامل تھا۔ اب سامعین اُن کی ان اداؤں کے بھی گرویدہ ہو چلے تھے اور جون اس کا خاص اہتمام کرنے لگے تھے۔

زاہدہ حنا سے علاحدگی کے بعد اُن کے یہاں رقت اور گریہ و زاری کا سلسلہ شدید تر ہوگیا تھا۔ لیکن یہ مسائل اس قدر گہرے، پیچیدہ اور نجی نوعیت کے ہیں کہ ان کے محرکات اور نتائج پر کوئی تبصرہ ممکن نہیں۔

آخری دنوں میں جون ایلیا ذرا اہتمام سے رہنے لگے تھے۔ ہم نے اُس آخری مشاعرے اور کھانے میں ایک ساتھ شرکت کی تھی جس کا انتظام PSO کے تحت اقبال کاظمی نے کیا تھا۔ اُس کے چند دن بعد ہی ڈھائی بجے رات کو میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹی وی چینل سے کسی نے کہا، ''سحر صاحب بول رہے ہیں؟ مجھے جون ایلیا کے بارے میں آپ کے تاثرات حاصل کرنے ہیں۔'' میں نے گھبرا کر کہا، ''اس وقت ڈھائی بجے رات کو؟ کیوں کیا ہوا؟''

اُدھر سے آواز آئی، ''جون ایلیا کا انتقال ہوگیا ہے۔ آپ کو نہیں معلوم؟'' اس قدر دل خراش خبر کے لیے میرا ذہن تیار نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ کسی نے سفاکی سے کاٹ کر جدا کردیا، پھر اُس کے بعد وہی مراحل اور مراسم درپیش ہوئے کہ سخی حسن کے ابتدائی حصے میں بھائی جان کو سپردِ خاک کردیا گیا، جہاں رئیس امروہوی اور اُن کی بڑی صاحب زادی پہلے سے آسودۂ خاک ہیں۔

جون ایلیا نے اپنی پوری زندگی ''موڈ'' کے تابع گزاری۔ ان کے موڈ موسموں کی طرح بدلتے رہتے تھے اور ان کا اظہار شاعری میں اسی طور اور تناظر میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے رویوں میں شدید تھے اور جہاں کہیں شدت آجاتی تھی، اُسے وہ سفاکی کی حد تک شاعری میں ڈھال دیتے تھے۔ انھوں نے ''شاید'' کے دیباچے میں اپنے والدِ گرامی کے بارے میں لکھتے ہوئے ''جہنم'' کا جو تذکرہ کیا ہے، اس میں جون کا مزاج زیادہ جھلکتا ہے۔ جون کہا کرتے تھے کہ میں غصے سے بھرا ہوتا ہوں لیکن اظہار بہت کم کر پاتا ہوں۔ اُن کا یہ غصہ اور گرد و پیش کی زندگی کی بے حسی اور لایعنیت انھیں کبھی کبھی کلبیت (Cynicism) سے بھی قریب کردیتی تھی۔ ان کی یہ کیفیت ان اشعار میں بطورِ خاص نمایاں ہے:

اُٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم

جو اک نسلِ فرومایہ کو پہنچے
وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم
نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم
چبا لیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اُسے خفا کیجے
ہے تقاضا مری طبیعت کا
ہر کسی کو چراغ پا کیجے

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا ہوں

جون نے شاعری میں جہاں جہاں غنائیت سے کام لیا ہے، وہاں اُن کا ڈکشن اور شعری جمالیات مکمل طور پر موجود ہے:

خوش گزرانِ شہرِ غم، خوش گزراں گزر گئے
زمزمہ خواں گزر گئے، رقص کناں گزر گئے
وادیٔ غم کے خوش خرام، خوش نفسانِ تلخ جام
نغمہ زناں، نوا زناں، نعرہ زناں گزر گئے

ے خانہ طرف آیا، یاراں! دل و جاں انگیز
وہ تشنہ لباں ہمدم، تہ جرعہ کشاں انگیز
شوریدہ سراں در پس، خونیں جگراں در پیش
گل گشت کو نکلا ہے، وہ جانِ جہاں انگیز

جون کو مشاعروں کی شرکت اور مقبولیت کے ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی ہوتا گیا کہ اب شاعری میں ہنرمندی کا دور نہیں رہا۔ انھوں نے بھی ترکیب طرازی اور مضمون آفرینی سے زیادہ اس پیرایے کو نکھارا جسے اُن کا مکالماتی کلام یا سہلِ ممتنع کا نام دیا جاتا ہے اور جس پر نئی نسل کے کئی شعرا تکیہ کیے ہوئے ہیں:

جانے مجھ سے یہ کون کہتا ہے
آپ اپنا خیال تو رکھیے

زندگی کیا ہے اک ہنر کرنا
سو قرینے سے زہر پیجیے گا

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

ہر لحظہ جی رہے ہیں دوا کے بغیر ہم
چارہ گرو تمھاری دعا چاہیے ہمیں

اس بنا پر عام طور سے یہ سمجھا جانے لگا کہ جون کی اصل پہچان اُن کی غزل ہے۔ لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ جون نے نظمیں بھی بہت خیال انگیز کہی ہیں اور ان

میں فکر و احساس کی بہترین آمیزش پیدا کی ہے۔ ایک زمانے میں جب بقول خود — جون کے سینے میں دم تھا اور سانس نہیں اکھڑتی تھی، تو وہ جم کر نظمیں ہی سنایا کرتے تھے۔ ان کا حافظہ اچھا تھا۔ نظمیں سناتے وقت بیاض سامنے نہیں ہوتی تھی۔ غرض بھائی جون پر ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ اُن کی شاعری اور شخصیت کے کئی زاویے اس کا تقاضا کرتے ہیں۔

O

جون ایلیا — آج کی شاعری کی شناخت

جون ایلیا جس کو میں آئندہ سطور میں صرف جون کہوں گا، اس لیے کہ ایسا کرنے کا مجھے حق ہے، اس رشتے کے حوالے سے جسے ہم اپنی روزمرہ کی زبان میں دوستی کہتے ہیں۔ جونؔ کو میں نے بہت قریب سے دیکھا اور ان سے شاعری سے لے کر فلسفے تک بہت سے موضوعات پر گفتگو کی۔ ان گفتگوؤں کے نتیجے میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ جون ایک کثیر الجہت اضطراب کا شکار ہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ اپنے آپ سے گریزاں بھی ہیں، مایوسی کی حد تک اور یہ بھی کہ ایک غیر محسوس سطح پر وہ بیک وقت احساسِ برتری اور احساسِ کم تری کا شکار بھی۔ جون نے اپنی شاعری کو نہ چھپوانے کی جو اپنے پیش لفظ میں بات کی، اس کے ڈانڈے تو آپ کافکا کے نفسیاتی الجھاؤ سے ملا سکتے ہیں مگر جونؔ کا مسئلہ جو اتفاقی سطح پر، اس واقعے کے حوالے سے جو انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے،ایک احساسِ جرم کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے،جس کی مثال آپ البیئر کامیوؔ کے ناول La Chute یا ''زوال'' میں دیکھ سکتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ احساسِ جرم سے زیادہ یہ احساس نفس درازی کے قریب ہے جس میں، میں نے جون کو کئی بار گرفتار دیکھا۔

جون کی شخصیت کبھی کبھی مجھے اتنی سپاٹ نظر آتی کہ میں ان کی غزل کے اس مصرعے:

میں مسطر پہ کھینچا ہوا خط میں

کو اسی احساس کی کوکھ سے جنم لیا ہوا سمجھتا۔ ان کی فطرت کی ''ٹیڑھ'' میں کسی مروّجہ نظامِ اخلاق یا کسی جمالیاتی نظریے سے کج روی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا تھا۔ یہ ٹیڑھ ان کے ہاتھوں اپنی ذات کے گرد کھینچی ہوئی ایک ایسی دیوار تھی جسے بیک وقت آپ چین کی دیوار، عشق اور دیوارِ گریہ کے نام سے یاد کر سکتے ہیں، اور یہ خود ان کے لیے اپنے خلاق ہونے کا ایک سمبل تھی۔ میں نے ان میں ایک ناقابلِ تسخیر خواہش abnormal ہونے اور کہلانے کی دیکھی اور بار بار دیکھی۔ لوگ ان کو جو فلسفی کہتے ہیں، میں اسے لغوی معنوں میں درست نہیں سمجھتا۔ فلسفی ہونا الگ بات ہے اور فلسفیانہ باتیں کرنا الگ۔ وہ ایک طرح انفرادیت پسندی میں گردن تک ڈوبے ہوئے آدمی تھے اور کیا زندگی، کیا دنیا، کیا شعر، کیا ادب اور کیا اخلاق، سب ہی پر اپنا ایک الگ نظریہ رکھتے تھے جو مروّجہ سوچ کی کبھی مبدل اور کبھی مسخ شدہ صورت رکھتا مگر اس distortion (یا مسخ کرنے کے عمل) میں بڑی نزاکت اور کسی حد تک ایسی ہی کچھ خوب صورتی پائی جاتی تھی جس پر راس بو پر فدا تھا۔ اگر آپ جون کو ان کے خاندانی پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو وہ آپ کو ایک nostalgic انسان بھی نظر آتے ہیں۔ غالباً اسی حسرت نے ان سے ایسے شعر کہلوائے جو ایک تخیلاتی تجربے کا اضطراب نظر آتے ہیں جس کے متعلق غالبؔ کا یہ مصرع ان پر صادق آتا ہے:

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

جون کے مجموعۂ کلام کا پہلا صفحہ پڑھتے ہی آپ کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ وہ paradox یا متضاد خیالی کے عاشق تھے۔ کبھی ان کا یہ عشق انتہائی صوفیانہ نظر آتا ہے تو کبھی محض سرسری۔

جون ایک مجلسی آدمی تھے مگر جبراً۔ یہ جبر ان کے اپنی wilderness (احساسِ ویرانی) نے ان پر عائد کر رکھا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک وہی کافکا والی یعنی خدا سے متعلق معتقدات پر استوار تھی۔ یہ بات کہ ''نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا کمیں''— بہت پہلے کافکا نے بہت ہی گہری اداسی کے ساتھ کہی تھی۔ اس حوالے سے ہم جون کو نطشے کی سی مذہبیت کی الم ناکی کی پیروڈی بھی کہہ سکتے ہیں۔ آخر آخر میں لڑکپن کے دوستوں کو ان سے کورے پن کی اور ان کی غیر مخلصی کی شکایت ہوگئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُن کے دوستوں کی سطح بینی تھی۔ کبھی کبھی بہت مخلص اور سچا انسان بھی غیر مخلص نظر آتا ہے، اگر ہم اسے ایسا سمجھنے لگیں۔ اور پھر جھوٹ اور سچ کا تو چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس بات کو سارتر نے بہت ہی تفصیل سے اپنے مضامین میں بیان کیا ہے۔ ٹی وی کے ایک پروگرام میں جس میں افتخار عارف کمپیئر تھے، انھوں نے اپنی مشہور غزل ''ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا؟'' پڑھتے پڑھتے کہا، ''یہ سب کچھ ذات بالذات چل رہا ہے۔'' اس جملے کو آپ جون کی شخصیت کی کلید کہہ سکتے ہیں۔ ایک اندر کا آدمی جو باہر سے اپنے آپ کو پرکھنے کا داعی تھا، اندر ہی کا رہا، باہر کا نہ ہوسکا۔ جس جس نے بھی جون کو بہت اپنا سمجھ رکھا تھا، اس کے لیے یہ صورتِ حال ذاتی سطح پر ہی نہیں بلکہ کائناتی سطح پر بھی بہت دکھ دینے والی تھی۔ جب بھی جون مجھ سے مل کر رخصت ہوتے تو میں ان کو اپنائیت کے دامن کو جھاڑتے ہوئے محسوس کرتا تھا۔ اس سے زیادہ مجھے جون کی شخصیت کے بارے میں اور کچھ نہیں کہنا۔ میں نے ان کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ کاملاً اپنے اور ان کے تعلق سے کہا ہے اور ان کو اگر کوئی جوں کا توں مان لے تو میں اس کا ضامن نہیں۔

اب آیئے، ہم جون کی شاعری پر گفتگو کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں

جونؔ کے اس مفروضے پر بات کرنا چاہوں گا کہ شاعری مابعد الطبیعیاتی ہو ہی نہیں سکتی۔ تھوڑی سی گفتگو مابعد الطبیعیات کے بارے میں۔ میٹافزکس یعنی مابعد الطبیعیات ماخوذ ہے یونانی لفظ Meta Physika سے جس کا لغوی مطلب ہے فطرت یا نیچر سے ماورا چیزیں، یہ قبل سقراط کا فلسفہ ہے اور وجودیات، کونیات اور علمیات ایسے شعبوں کو محیط ہے۔ جدید فلسفہ کہتا ہے کہ مابعد الطبیعیات حقیقت کے ان فطری اور آفاقی عناصر سے بحث کرتی ہے جو آئے دن کی زندگی کے تجربات سے ماورا ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے وجودی مفہوم پر بنیاد رکھتی ہے اور اس کا تعلق انسان کے اس ادراک سے نہیں ہوتا جس کا تعلق معروضی دنیا سے ہوتا ہے۔ پلوٹی نس کہتا ہے، اس ادراک کا منبع خدا کی ذات ہوتی ہے۔ بعد میں سائنس کی ترقی کے ساتھ Enlightenment (دورِ تعقل) اور سائنسی انقلاب کے بعد ان دونوں نظریات میں زبردست تصادم ہوا اور پھر اس کے بعد وہ دور آیا کہ نہ تو سائنسی معروضیت کو حتمی مانا جانے لگا نہ مابعد الطبیعیاتی۔ مابعد جدیدیت اور رد ساختیات دونوں کا رویہ ان دونوں نظریات کے سلسلے میں انتہائی ناقدری کا رہا۔ سائنسی حقیقت یا معروضیت کا تو خود آئین اسٹائن نے یہ کہہ کر قلع قمع کر دیا کہ یہ ایک فریب نظر ہے، گو جاری و ساری ہے اور رہے گا۔ لہٰذا باہر یا اندر کی تفریق ہیوم اور برکلے کے فلسفے کے تحت ایک مذاق بن کر رہ گئی جس پر ایک من چلے نے کہا، "No matter never mind"۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ صرف باہر کی دنیا ہی کو خود آگہی اور خدا آگہی کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے، غالباً ایک مغالطہ یا خام خیالی ہے۔

اب کچھ زبان کے بارے میں۔ جون کا یہ کہنا کہ زبان باہر ہوتی ہے اور شاعر کبھی اپنے ذہن میں نہیں سوچ سکتا اور صحیح شاعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو باہر سے پرکھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو اب بہت پرانی ہو چکی۔ جدید ترین نظریہ زبان

کے بارے میں اب یہ ہے کہ حقیقت یا معروضیت اب زبان سے باہر پائی جاتی ہے۔ اور اس سلسلے میں دوستوئیفسکی کی یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ فن، ادب یا فلسفے کا کوئی بھی شاہکار ہم کو اپنی جکڑ میں لے لیتا ہے اور ہم اس کے طلسم میں اپنی آگہی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن میں کون ہوتا ہوں جونؔ سے ان کے معتقدات چھیننے والا؟ ہر ادیب، شاعر اور مفکر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نظریے کے تحت اپنی فنی دنیا کی تشکیل کرے۔

اور اب آیئے شاعر کی پہچان کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کرتے چلیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے کہ کسی بھی فن کار کی پیش رفت ایک مسلسل قربانی سے عبارت ہے اور وہ قربانی اس کی ذات کی ہے۔ اُس کی اِس بات کو بہت غلط رنگ دیے گئے۔ دراصل وہ شاعر کی شخصیت کے فنا ہو کر پھر جنم لینے کی بات کر رہا تھا۔ اس لحاظ سے شاعر کا وجود ایک becoming بن جاتا ہے۔ جہاں تک شعر کے rythm یا وزن کی بات ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ شعر کا جزو لاینفک ہوتا ہے، مگر اس کے بارے میں ہم صرف یہ کہہ کر بات ختم نہیں کرسکتے۔ یوں تو اس ضمن میں ایذرا پاؤنڈ نے بہت موشگافیاں کی ہیں مگر ان سب کا مطلب مآل کار یہ ہے کہ Style is man یعنی انسان کا اسلوب ہی اس کی پہچان ہے، اور اسلوب بغیر rythm کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کا اس سلسلے میں یہ قول کہ شعر کی وزن کی حرکت پذیری، چاہے وہ شاعر کے دروں سے پیدا ہو یا بیروں سے اندر اور باہر کی تفریق کو مزید اجاگر کرتی ہے اور اس طرح شاعری یا شعر کو یا تو درونی بنا دیتی ہے یا معروضی۔ اور اس بات سے ہم شاعری کی لے اُس کے lyrical یا غنائی ہونے تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب زبان (لکھی ہوئی) آواز بن جائے تو وہ معاشرے میں حلول کرجاتی ہے اور پھر ہم شاعر کی انفرادیت کی بات شاعر کی اس صلاحیت کی بنا پر کرتے ہیں کہ وہ اس غنائیت کو مآل کار خموشی سے قریب تر

رکھنے کے سلسلے میں کتنا پر جوش ہے، جیسے کہ میلارمے یا پھر دور رکھنے کے حوالے سے جیسے کہ پاؤنڈ۔ اردو غزل کو ہم لیرک سے قریب تر کی چیز سمجھتے ہیں اور ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ ان ہی نظریات اور معروضات کی روشنی میں اب ہم جون کی شاعری کا ''شاید'' اور ''یعنی'' کے حوالوں سے جائزہ لیتے ہیں۔ چوں کہ تقریباً ان ہی نظریات کا جون نے اپنے پیش لفظ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ تذکرہ کیا ہے۔ ''شاید'' جس طرح بھی چھپی اس کی تفصیل خود جون نے اپنے پیش لفظ میں دی ہے۔ ''شاید'' کی پہلی نظم سے لے کر قطعات تک شاعر کی جو بات قاری کو متوجہ کرتی ہے نہ وہ جونؔ کی فکر ہے، نہ فلسفہ بلکہ اس کی انفرادیت۔ یہ انفرادیت اس نے اپنے اسلوب سے پیدا کی ہے۔ اور ایک ایسی دنیا کی تخلیق سے جو کبھی خواب اور کبھی حقیقت کے تال میل سے منحرف ہو کر آشکار کی گئی ہے۔ اگر جون نے اپنے ہی کہنے کے مطابق اپنے آپ کو باہر سے پرکھا ہے تو اندر کا ہو کر رہ گیا اور جب اندر کا ہو گیا تو وہ اس سے پوری طرح باخبر تھا۔ پھر باہر اور اندر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے اور یوں جونؔ نے اپنی شاعری میں معروضی داخلیت پیدا کی اور کہیں داخلی معروضیت اور یہی اس کا من بھاتا paradox بنا۔ آیئے اب کچھ نظموں کے اقتباسات اور غزلوں کے شعروں سے ہم اپنی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

میں تم کو شاید یکسر بھولنے والا ہوں
شاید جانِ جاں شاید
کہ اب تم مجھ کو پہلے سے زیادہ یاد آتی ہو

....

متاعِ دل، متاعِ جاں تو پھر تم کم ہی یاد آؤ

(شاید)

بے طرف شام کے ابہام کی سرسبزی میں
جو تنفس سے خموشی کے سنا ہے میں نے
ایسا نغمہ کسی آواز کے جنگل میں نہیں

(نوائے درونی)

اور پھر میں نے
موجود کے دائرے کی نہایت پہ نالہ کیا
اے یقیں کے گماں
اے گماں کے یقیں
اے ازل آفریں
اے ابد آفریں
اے خدا الوداع
اے خدایاں خدا
الوداع، الوداع

(رمز ہمیشہ)

اور اب کچھ شعر غزلوں سے دیکھیے:

یہاں معنی کا بے صورت صلا ہیں
عجب کچھ میں نے سوچا ہے لکھا ہیں
بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا ہیں

ایک ہی مژدہ صبح لاتی ہے
دھوپ آنگن میں پھیل جاتی ہے

جل اٹھا دل، شمالِ شام مرا
تو نے بھی میری دل دہی کیا کی

میں تمھیں خاطر میں لاتا ہی نہیں
ہشت اے دشوار اے آسان ہشت

زمیں تو کچھ بھی نہیں آسماں تو کچھ بھی نہیں
اگر گمان نہ ہو درمیاں تو کچھ بھی نہیں

میں اور فقط اسی کی خواہش
اخلاق میں جھوٹ بولتا ہوں

بس اس کے بعد میں اور کوئی شعر یا نظم کا بند پیش نہیں کروں گا اس لیے کہ میرا ان منقولہ اشعار سے مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ان تمام اشعار کو دیکھیں تو ان میں آپ کو کوئی نہ کوئی paradox ضرور ملے گا اور جون بھی ملے گا جو اپنے آپ کو باہر سے پرکھتے پرکھتے اندر کا ہو گیا۔ وہ اندر کی گواہی لے آیا اپنی سچائی کے لیے۔ جون کو پڑھ کر مجھے کبھی تو لگتا ہے کہ یہ جلا وطنی کی شاعری ہے۔ اور ''شاید'' کا شاعر یعنی جون ہمیں ایک ایسا نرالا شاعر نظر آتا ہے جو خلاؤں میں زندہ رہنا جانتا ہے۔ وہ ایک چلتا پھرتا سناٹا تھا جس نے دنیا کی دھوم کو اپنے اندر بسانے کی کوشش کی اور پھر خود ہی اس شور

سے ہراساں ہو گیا۔ میں آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جون کی شاعری اس کی شناخت ہو یا نہ ہو مگر شاعری کی اور اس دور کی شاعری کی شناخت جون ضرور ہے۔

ایک اور بات جو جون کی شاعری کو ممتاز کرتی ہے، وہ ہے اس کا وہ معیار جو ہائیڈیگر نے قائم کیا اور جس کا میں تو ہمیشہ قائل رہوں گا کہ اس نے Holderlin کی طرح اپنے باہر کو آدم کی طرح نام دیے ہیں اور اس کی تشبیہات کی رنگا رنگی میں بیک وقت pathos اور کہیں کہیں bathos کا پایا جانا جو ہمیشہ سے اعلیٰ شاعری کا ثبوت سمجھے گئے ہیں اور شاعر کا کمال بھی، اس کے ہاں اتنی روانی اور تصنع کے بغیر آتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ اور حیران کرنے کے فن میں بھی جون کا قائل ہونا پڑتا ہے، اس کی شاعری کبھی برسات کے موسم کی رم جھم ہے تو کبھی دھوپ کے آنگن کا حسن۔

○

جون ایلیا — بیزاری و بغاوت کا شاعر

جون ایلیا پر لکھنا آسان کام نہیں۔

میں ان سے کبھی ملا نہیں۔ ان کو دور سے دیکھا بھی نہیں، پھر بھی کراچی میں راحت سعید سے لے کر کینیڈا میں اقبال حیدر تک ان کی شخصیت و شاعری کو لے کر عجیب و غریب تذکرے اور چرچے سنے۔ ان کی شاعری کے الجھاوے، تضادات، تصادمات وغیرہ یہ سب کچھ خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کچھ شاعروں کے معاملات عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں۔ خاص طور پر ایسا شاعر جس نے ایک مخصوص و مضبوط علمی و تہذیبی پس منظر پایا ہو، طرح طرح کے علم حاصل کیے ہوں، حیات و کائنات کے تعلق سے ایک خوش گوار اور صحت مند تصور قائم کیا ہو، لیکن اگر دنیا اس کے مزاج و معیار کے برعکس، غلیظ ہو، تقلیب و تخریب کا شکار ہو تو آبگینوں میں ٹھیس لگ جانا اور بیزاریوں اور پیچیدگیوں کا پیدا ہو جانا عین فطری ہے۔ اسی لیے اکثر جون کو بیزاریوں اور ناآسودگیوں کا شاعر کہا گیا۔ یاسیت و قنوطیت کے آثار تلاش کیے گئے جو بڑی آسانی سے ان کی شاعری میں مل بھی جاتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی بیزاریوں اور ناآسودگیوں کو غالباً ایک خاص قربت اور فکری و

نفسیاتی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی جیسا کہ ایک مختصر سے مضمون میں کمال احمد صدیقی نے محسوس کیا اور لکھا، ''ان کی نا آسودگی عام انسانوں کی زندگی اور نا آسودگیوں کی نمائندگی کرتی ہے۔'' جونؔ ایلیا ایک طرف یہ کہتے ہیں:

خواب و خیال و وہم و گماں کچھ نہیں بچا
کیا پوچھتے ہو دل کا زیاں کچھ نہیں بچا
اب کیا دکھاؤں فردِ حسابِ نبود و بود
بس مختصر یہ ہے کہ میاں کچھ نہیں بچا

تو دوسری طرف اس تیور کے اشعار بھی جا بجا نظر آتے ہیں:

مر نہ جاتے تو اور کیا کرتے
بے تمنا جیا گیا ہی نہیں
جون گویائی میں ضرر تھا بہت
پر لبوں کو سیا گیا ہی نہیں

جونؔ کی شاعری انھیں دونوں رنگوں کے درمیان کی شاعری ہے بقول کمال احمد صدیقی ''قنوطیت اور رجائیت کا ایک عجیب سنگم ہے اور یہ سنگم ایک Paradox ہے۔'' جون کا یہ ایک فطری تخلیقی عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان رنگوں کے درمیان غالب رنگ کیا ہے۔ اس تلاش میں ان کی غزلوں سے زیادہ نظمیں معاونت کرتی ہیں۔

مجموعے کی ابتدا ہی نظم ''شاید'' سے ہوتی ہے:

میں شاید تم کو یکسر بھولنے والا ہوں
شاید جانِ جاں شاید...

ان دو مصروں میں شاید کا لفظ تین بار آیا ہے، جو مصرعوں کے بہاؤ اور اسلوب کے لیے ضروری تو ہے ہی محبت اور نفسیات کی تشکیلی امیج بھی ابھرتی ہے۔ چوں کہ نظم خالص

رومانی ہے، اس لیے اس کا لب ولہجہ یادوں سے پُر ایک ایسا عشقیہ لہجہ ہے جہاں بقول حسرت موہانی ''بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں۔'' والی کیفیت و روایت سے وابستہ ہو جاتا ہے لیکن نظم کے مصرعے:

متاعِ دل، متاعِ جاں تو پھر تم کم ہی یاد آؤ
بہت کچھ بہہ گیا ہے سیلِ ماہ و سال میں اب تک
سبھی کچھ تو نہ بہہ جائے
کہ میرے پاس رہ بھی کیا گیا ہے
کچھ تو رہ جائے

رومانی نظم ایک سنجیدہ تأثر کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے جہاں وہ حیات و کائنات کے زیر و بم اور کیف و کم سے جوڑ کر اس کی معنویت کے دائرے کو وسیع تر کرتے ہیں۔ لیکن نظم میں بظاہر ہلکی سی ڈری ڈری سے فضا اسے نفی اور نا آسودگی کی پٹری پر ڈالے رکھتی ہے۔

اس کے فوراً بعد دوسری نظم ''رمز'' میں ان کی پیچیدگی اور الجھی ہوئی پریشان شخصیت کے بھید کھلتے نظر آتے ہیں کہ جہاں افکار اور ہجوم ایمان و ایقان کبھی کبھی تصور و تخیل کی ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں شاعر کا ذہن مثالی دنیا اور مثالی معاشرے کی ایسی تصویر قائم کرتا ہے جو عملی اور حقیقی دنیا سے کافی دور اور ناممکن سی لگتی ہے جس کی وجہ سے فکری ہجوم، کثرتِ موہوم کا شکار ہو کر کبھی کبھی Nihilism کا شکار ہو جاتا ہے۔ تبھی تو شاعر کہتا ہے:

میرے کمروں میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر
ان میں اک رمز ہے

جس رمز کا مارا ہوا ذہن
مژدۂ عشرتِ انجام نہیں پا سکتا
زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا

شاید جون کو کبھی آرام نہیں ملا۔ امروہہ ان کے سینے میں اور قدم کراچی کے زینے پر جہاں آدمیت، شرافت سب ڈسٹرب کرتے ہیں۔ چناں چہ مثالیت کا محل ریت کی طرح بکھر جائے تو حساس شاعر کو چین کہاں سے آئے۔ تو اسی بے چینی کی زمین سے خیالات کے نئے نئے گل بوٹے نمودار ہوئے جسے عام و خاص نے طرح طرح کے نام دیے لیکن روح کی گہرائی اور خیال کی مقدس بے چینی اور پاکیزہ اضطراب کو کوئی چھو نہ سکا جو جون ایلیا کے مذہبِ دل، تاریخِ انسانیت، تہذیبِ نفس اور حسنِ معاشرت کے حوالے سے اس کو حیران و پریشان کیے ہوئے تھے، جس کے آڑے ترچھے عکس ان کی نظموں میں جلوہ گر ہیں۔ کم لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ زندگی میں کبھی آرام نہ پانے کا احساس دعوتِ عمل ہے اور دعوتِ فکر بھی اور حیات کے اس تسلسل و ارتقا کا اشاریہ بھی جس سے زندگی نمو پذیر ہوتی ہے، ہچکولے کھاتی ہے، تصادمات کا شکار ہوتی ہے اور اپنی بوقلمونی و رنگارنگی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ اسے سود و زیاں اور روز و شبانہ سے اوپر اٹھ کر کس طرح محسوس کیا جا سکتا ہے، یہ ایک حساس سنجیدہ فلسفی و شاعر کے دل سے پوچھیے جو حیات و کائنات کو خارجی مظاہر میں کم باطن کی لہروں میں زیادہ دیکھتا ہے اور باطن کی صدا اسے خارج کی تمام صداؤں سے بہتر لگتی ہے۔ تبھی تو وہ کہتا ہے:

جو نغمہ سے خوشی کے سنا ہے میں نے
ایسا نغمہ کسی آواز کے جنگل میں نہیں

یہ سچ ہے کہ شاعری باطن کی نرم و نازک اور بے چین صدا ہوا کرتی ہے لیکن عموماً اس کے دباؤ خارجی ہوا کرتے ہیں۔ اسی لیے نظمیہ لہجہ اکثر خارجیت سے فرار حاصل نہیں کر

سکتا۔ فکر، بیان اور مزاحمت کا لہجہ اختیار کر کے ایک مخصوص فکری اور جمالیاتی پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن لہجہ مزاحمت کا ہو یا محبت کا، جون جیسا پختہ اور قادر الکلام شاعر اسی فطری رجحان اور وجدان کو ایک مخصوص تخلیقی و جمالیاتی پیکر میں ڈھال کر وہ ہیئت اور روپ عطا کرتا ہے جہاں صرف مزاحمت ہی نہیں بلکہ انسانی اور احتجاجی شاعری کے نئے نئے در وا ہوتے ہیں:

غرورِ جبہ و دستار کا زمانہ ہے
نشاطِ فکر و بساطِ ہنر ہوئی برباد
فقیہ و مفتی و واعظ پہ حرف گیر ہو کون
یہ ہیں ملائکہ اور شہرِ جنتِ شداد

اسی ہوس میں ہیں ہر دم یہ دشمنانِ جمال
جو سوئے رنگ اٹھے اُس نظر کو گل کر دیں
جو بس چلے کہیں ان کا تو یہ قضا بیزار
شفق کا رنگ بجھا دیں سحر کو گل کر دیں

دس بندوں کی معیاری نظم ''شہر آشوب'' مزاحمت اور عہدِ حاضر کے کربناک اور عبرتناک صورتوں کا فکر انگیز اعلامیہ ہے جو نہ صرف روایتی شہر آشوب نگاری سے مختلف ہے بلکہ ایک نئے شعری ذہن اور وژن (vision) کی غماز بھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس نظم میں ترقی پسند شاعری جیسی نشاطیہ کیفیت نہیں ہے۔ آمید و آرزو کی کمی بھی کھٹکتی ہے۔ لیکن بے چینی و بے قراری کو نظمیت و شعریت کا روپ دینا بڑی اور با مقصد شاعری کو جنم دینا اور تخلیق کی زیریں سطح سے انسانیت کا پیغام دینا اپنے آپ میں غیر معمولی شاعرانہ و فن کارانہ عمل ہے جس سے جون ایلیا بحسن وخوبی گزرے ہیں:

ان کی ایک نظم ہے ''سلسلہ تمنا کا'' جو، ان کی عمدہ نظموں میں ایک ہے۔

آرزو، تمنا، خواب یہ سب وہ انسانی وجذباتی اوصاف وعناصر ہیں جن پر انسان اور کائنات کی ترقی وتبدیلی کا انحصار رہتا ہے۔ نیز انسان دوستی اور دردمندی کے عناصر بھی اسی راہ سے ہموار ہوتے ہیں اسی لیے ارباب اقتدار آرزوؤں، تمناؤں پر پہلے ضرب لگاتے ہیں، کیوں کہ نہ ہوگا خواب اور نہ ہوں گی اس کی تعبیریں کیوں کہ خواب کی عدم تعبیر و عدم تکمیل ہی انسان کو بے چین کرتی ہے اور اضطراب و احتجاج کے راستے پر لے جاتی ہے۔ نظم کی شروعات اچھے ڈھنگ سے ہوتی ہے:

خیال و خواب کو اب مل نہیں رہی ہے اماں
نہ اب وہ مستیِ دل ہے نہ اب وہ نشۂ جاں
نہ ٹوٹ جائے کہیں سلسلہ تمنا کا

دردمند شاعر، آرزوؤں کا فن کار اس تمنا کو جگائے رکھتا ہے، خواہ وہ خون سے جاگے یا شراب سے۔

نہیں ہے گردشِ ساغر تو گردشِ خوں ہے
سو اپنی گردشِ خوں سے ہی کچھ سوال کرو

اور نظم کئی سوالوں کی طرف مڑ جاتی ہے۔ لیکن شاعر نے سوال و جواب اور اس کے پیچ وخم کے مقابلے کیف وکم پر زیادہ توجہ دی ہے۔ فلسفیانہ طور پر الجھنے کے بجائے شعرانہ طور پر ترغیب دی ہے جس سے فن اور جمال، حرکت وجلال کے ملے جلے عناصر کے ذریعے یہ نظم اقبالؔ اور فیضؔ کے رنگ میں ڈھل کر امید ونشاط اور جستجوئے حیات کا جامہ پہن لیتی ہے:

کوئی امید دلاؤ کہ آرزو تو رہے
نظر اُٹھے نہ اُٹھے دل ہی کچھ ٹھہر جائے
قدم اُٹھیں نہ اُٹھیں کوئی جستجو تو رہے

ہو چارۂ غمِ جاں کیا یہ گفتگو تو رہے

چارۂ غم کی اصطلاح سے نظم انفرادیت و محدودیت کا شکار سی لگتی ہے۔ لیکن یہاں شاعر نے اس کو وسیع تناظر میں استعمال کر کے نظم کو بلندی اور وسعت عطا کی ہے۔ آخری حصے میں عاشقانہ جذبات کے ساتھ نظم ختم ہوتی ہے لیکن یہ آخری شعر:

سو زخمِ شوق کو جلتا ہوا تو رکھنا ہے
نہ ٹوٹ جائے کہیں سلسلہ تو رکھنا ہے

ترقی پسند احساس پر ختم ہوتا ہے جس کے جلال و جمال سے کہیں اقبالؔ، کہیں فیضؔ اور اکثر جون کا اپنایا سیّتی تحرک اور فلسفیانہ صحت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ واضح تصورات میں ڈوبی یہ نظم اپنے مخصوص و منفرد اسلوب و آہنگ کے اعتبار سے اتنی ہی پاکیزہ اور متاثر کن ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عمدہ تخلیق کے لیے اور تنظیم کے لیے خیال کا واضح ہونا اور بڑا ہونا ضروری ہوا کرتا ہے۔ خیال کا ابہام نظم کو ژولیدگی سے بچا سکے ایسا کم ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ نظم اس کی عمدہ مثال ہے۔ فکر و خیال اور حرف و صوت میں ڈھلی ہوئی نظم بلاشک و شبہ اس عظیم اور مضبوط ترقی پسند روایت کو آگے بڑھاتی ہے جس کے سلسلے فیضؔ، اقبالؔ سے ہوتے ہوئے حالیؔ اور غالبؔ سے جا ملتے ہیں۔ لیکن کیا یہ شاعر کا غالب رجحان ہے؟ یہ سوال پریشان کرتا ہے اور دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔ کیوں کہ اس کے فوراً بعد کی نظم اذیت کی یادداشت یا اس کے آگے پیچھے کی نظمیں ''اجنبی شام''، ''وصال''، ''سزا'' اور کسی حد تک ''اعلانِ رنگ'' میں بھی یاسیت و قنوطیت کا اثر زیادہ ہے۔ کہیں بھٹکنے کی بات ہے تو کہیں مر جانے کی:

موسمِ جسم و جاں رائگاں
دلِ زمستاں زدہ طائرِ بے اماں
جس میں اب گرمیِ خوابِ پرواز تک بھی نہیں

اسی طرح نظم "آسائشِ امروز" جس میں وقت کا تصور پیش کیا گیا ہے:

وقت گزرا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا
سازِ امروز کا ہر تار بکھر جائے گا

یا

ہر نفس جاں کنی ہے جینے میں
اک جہنم ہے میرے سینے میں

(مفروضہ)

جہاں کچھ بھی نہیں تنہا خلا ہے
نظر کا سارا سرمایہ خلا ہے

(خواب)

لیکن یاسیت و قنوطیت عارضی ہے، لگتی ہے کہ اکثر اس مزاج کی نظموں کی انتہا جون کے اصل مزاج اور تیور پر ہی ختم ہوتی ہے، مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

ہم نے اپنے درشت لہجے سے
آمروں کا غرور توڑا ہے
ہم تو خاطر میں بھی نہیں لاتے
اہلِ دولت کو شہریاروں کو
ہم نواگر ترے عوام کے ہیں
دوست رکھتے ہیں تیرے پیاروں کو

یا ان کی ابتدائی نظموں میں "دو آوازیں" کا یہ بند دیکھیے:

سنو کہ فردوسیِ زمانہ پرکھ چکا ظرف غزنوی کو

جو فکر و فن کو ذلیل کر کے عزیز رکھتا ہے اشرفی کو
تقدسِ بت شکن میں دیکھا تکلفِ ذوقِ بت گری کو

اور پھر عام لوگوں کے لیے یہ پکار اور للکار:

یہ لوگ جمہور کی صدا ہیں یہ لوگ دنیا کے رہنما ہیں

جون کا اصل لہجہ یہی ہے جہاں نہ صرف وہ حقیقی جذبات میں ڈوبتے ہیں بلکہ فکر و نظر کی وحدت اور اس کا کھرا پن ان کی نظموں میں پورے تخلیقی جوہر اور توانائی کے ساتھ چھلکا پڑتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکثر ان کا لہجہ ان کی پیچیدہ شخصیت اور بیزار طبیعت کے تلے دب سا جاتا ہے لیکن یہی وہ مقامِ مسرت و بصیرت ہے جہاں وہ فکری اور فطری طور پر کھلے ہیں اور پرواز کرتے ہیں۔ انھوں نے خود کلامی میں بھی جا بجا یہ اعتراف کیا ہے کہ:

> میرا خیال یہ تھا کہ میرے ہر وقت کے اشتعال، میری تلخ مزاجی، بے آرامی، بیزاری اور دل برداشتگی کا ایک اہم سبب سامراج کی غلامی ہے۔
>
> جہاں تک کمیونزم کی سماجی سائنس کا تعلق ہے تو میں اس پر اپنی پوری استقلالی، شاعرانہ اور اخلاقی حالتوں کے ساتھ یقین رکھتا ہوں۔

مزاحمت اور بغاوت کے بڑے روپ ہوا کرتے ہیں جتنے کہ ظلم و جبر کے روپ خارجی طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ادب میں مزاحمت کے روپ اکثر باطنی لہروں میں ڈوب کر سر اٹھاتے ہیں۔ اظہار کے کئی وسائل اندرون میں جذب ہو کر تحلیل ہو کر، تخلیقی کرب کا حصہ بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ جون ایلیا کی شاعری کچھ ایسی ہی ناآسودگیوں، بیزاریوں اور بغاوتوں کی شاعری ہے جسے انقلاب کے خارجی مظاہر سے کم باطنی، بے چینیوں سے آنکنے اور تخلیق کے بطن میں جھانکنے کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ پابلو نرودا نے غالباً ایسے ہی شاعروں کے بارے میں دل لگتی بات کہی ہے:

ادب تخلیق کرنا بذاتِ خود ایک مزاحمتی عمل ہے، کیوں کہ ادیب اپنے گرد وپیش سے conform نہیں کر پاتا اور اس کش مکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ ایک طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی۔

جون ایلیا نے اداسی، بیزاری کو مزاحمت کا جو رنگ و آہنگ دیا، فکر و فلسفہ کو جو روپ دیا جو شاعری کی، جو زندگی گزاری وہ عام انسانوں، تمام شاعروں کے مقدر میں نہیں ہوا کرتی۔ اس کے لیے آمریت کو ٹھوکر مارنا، عیش و آرام کو ازخود آزار میں بدلنا اور دربدر ہونا پڑتا ہے اور پھر اعلانیہ یہ کہنا پڑتا ہے:

سہولت سے گزر جاؤ مری جاں
کہیں جینے کی خاطر مر نہ رہیو

سینہ دہک رہا ہو تو کیوں چپ رہے کوئی
کیوں چیخ چیخ کر نہ گلا چھیل لے کوئی

○

جونِ سوختہ جاں

کہا جاتا ہے کہ جون ایلیا کو مرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔ جی ہاں جون کو مرے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ شاید یہ سچ بھی ہے کہ گوشت پوست کے بنے ہوئے اپنے وجود کی جسمانیت پر نالاں اور رشتوں میں جکڑے ہوئے جذبوں کی سطحیت پر پشیماں اس آدمی کو مرے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا مگر کیا وہ ارتیابیت گزیدہ اور اپنی حالت خیزی، رمزیت آمیزی اور دل انگیزی کے سبب واماندہ و درماندہ شاعر، اور کیا وہ نفی پسندی و فوضویت انگیزی کے باعث وجود کی جسمانی ناگزیریت پر برہم فطانت مآب بھی فنا ہو گیا اور وہ تخلیقیت سے سرشار زمانی و مکانی قید سے مملو جمال کا صورت گر بھی مر گیا؟ نہیں، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ایک ایسا عمیق "مثالیہ پسند" شاعر اور خیال و وجدان کا فسوں گر، جس کے نفس نفس میں احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ یکسر ہم آہنگ ہو کر ایک تخلیقی وحدت کی شکل اختیار کر لے، کیا وہ بھی فنا ہو سکتا ہے؟ جی نہیں۔ جو زندگی کو جواز فراہم کرے اور جو وجود کی ثنویت کا اقرار کر کے اسے خارج اور باطن میں ہمہ وقت پائندگی دے، وہ کیسے مر سکتا ہے؟ جون نے اپنے مخصوص انداز میں جمالیاتی اور اخلاقی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے فن کے

تعلق سے جمالیات کو عقیدے اور اخلاقیات کا حدِ فاصل بتایا ہے اور ''مابعد الطبیعیاتی حقائق'' کے شعرا اور اصل شعرا میں امتیاز کرتے ہوئے جمال کو غیر رومانی و غیر مکانی ماننے سے انکار کیا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب شاعر اپنی فطرت کی ارتقائی حالت میں جمالیات کی آہنگ سازی اور صورت گری کرتا ہے تو وہ خود غیر زمانی اور غیر مکانی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے فن کے ساتھ خود بھی امر ہو جاتا ہے اور جون بھی امر ہے بلکہ ''امرت'' ہے کیوں کہ اس کے یہاں جمالیاتی تفہیم اپنی خوب صورت ترین صورتوں میں آشکار ہوتی ہے۔ جون نہیں مر سکتا، جون زندہ ہے اور زندہ رہے گا بلکہ جون ہی کیا اُس کی قبیل کے تمام خدا شعار تخلیق کار زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

اب اس دنیائے دنی کی سفاکی دیکھیے کہ جون جیسا نابغۂ روزگار، اپنی تمام تر خلاقیت کے باوجود موت کی پناہوں میں زندگی کی تمازتوں اور بے اعتنائیوں سے محفوظ ہے اور کیوں نہ ہو، جون جیسا social misfit، سماجی باغی، اپنی تمام تر خلاقانہ فطانت، تہ داری اور charismatic رعنائیوں کے ساتھ عام تخلیق کاروں کو متاثر کر سکتا ہے اور بہتر بنا سکتا ہے مگر ان میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ گویا مربی تو ہو سکتا ہے مرکزِ نگاہ نہیں۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے ان تمام لوگوں کو جو زندگی کے کسی بھی موڑ پر اور تاریخ کے کسی بھی دور میں آئے ہیں، اپنے زمانے میں بدحال اور ناآسودہ رکھا ہے۔ یہ ایک social behavior کی بات ہے جو ضروری نہیں کہ ہر شاعر، ادیب یا فن کار میں ہو۔ اس کا تعلق براہِ راست آپ کے conviction اور commitment سے ہے، فن جس کا اظہار ہو سکتا ہے مگر مدار نہیں۔

جون جیسا انا پرست عالم فوضویت کا شکار ہو سکتا ہے مگر مصلحت کا نہیں۔ یہ مزاج کا خاصہ نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر چیز اپنی ضد کی صورت میں وقوع پذیر ہے۔ جو ہے وہ نہیں ہے اور جو نہیں تھا، وہ ہے۔ اس معکوس رویے کی بنا پر تخلیق میں پہلو داری، درایت اور ایک ابدی کشش تو پیدا ہو جاتی ہے مگر خالق اندر ہی اندر پارہ پارہ ہوتا رہتا ہے۔ جون کے ساتھ

بھی یہی ہونا تھا اور یہی ہوا۔ جون نے جس کا انکار کیا، اس کے حصار سے نہیں نکل پائے، چاہے وہ شخصی سطح پہ ہو یا ماورائی سطح پر۔ اور ایسا نہیں ہے کہ جون اس قبیل کے لوگوں میں اکیلے ہیں۔ یہ تاریخ ساز، معاشرہ خیز اور انسانیت شعار لوگوں کا وتیرہ رہا ہے ــــ آج بھی کل بھی اور آئندہ بھی۔

جون کی شاعری پر گفتگو کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ اُن کے بارے میں کچھ اور بات کی جائے۔ جون تو مجلسی اور معاشرتی آداب سے اپنے آپ کو مبرّا کیے ہوئے تھے۔ وہ بالکل بے خبر نہیں تھے۔ social norms برتنے کی چیز ہے اور جس معاشرے میں منافقت رگ و پے میں سرائیت کر چکی ہو، وہاں اس ظاہری اخلاق کو تج دینا ہی بہتر ہے۔ جون نہ صرف اس کلیے سے واقف تھے، بلکہ اس بات پر مُصر تھے، عملی اور فکری دونوں لحاظ سے، جبھی تو کہا تھا:

میں بے ہوشی میں بھی بے ماجرا نہیں

ایک عالمِ بے پروا میں گم اور قلندرانہ بے نیازی کے باوجود انھیں غافل یا منفعل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر جون کہیں پر موجود ہوں تو فضا ان کی حیثیت کا اور منصب کا مژدہ لیے خاموشی سے زینتِ گوش سناتی رہتی تھی۔ جن لوگوں کو جون شب زندہ دار کے ساتھ شب باشی کا موقع ملا ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ پچھلے پہر کے گداز اور عالمِ سرخوشی میں جون انتہائی شدت کی اذیت ناکی جھیلنے کے باوجود علم و دانش کا ایک ایسا جیتا جاگتا پیکر ہوتے تھے کہ ان سے نہ صرف سننے اور دیکھنے والوں کو عقیدت ہو جاتی تھی بلکہ یہ انکشاف بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنے ''ہم عصروں'' نہیں ''عصر'' سے کتنے آگے ہیں۔ یہ صرف تعریفی جملے اور منقبتی اصراف نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہوا ایک ایسا ابدی تاثر ہے جو زندگی بھر ساتھ رہتا ہے۔ جون کے انتہائی ذاتی اور منفرد لب و لہجے اور اسلوب پر گفتگو کرنا اتنا آسان نہیں ہے، اس میں ان کا کوئی مربّی نہیں، نہ اس دور میں نہ اس سے پہلے۔ یہ

بات پوری ذمے داری سے کہی جا رہی ہے اور اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں لیا جانا چاہیے کہ ان کا اسلوب اور اسٹائل کسی سے یا سب سے بہتر تھا۔ یہاں تقابلی گفتگو نہیں ہے بلکہ صرف اتنا کہ ان کا اسلوب جتنا ذاتی (personal) تھا، اتنا اردو میں کسی اور کا نہیں سوائے میرؔ کے۔ جون کے یہاں بھی evolution تھا مگر creation بتدریج زیادہ تھا۔ ان کے سابقین میں کوئی بھی اُن کے اسلوب کا براہِ راست منبع یا source نہیں تھا۔ یہ ان کے ذہن کا کرشمہ تھا۔ اس ایجاد و اختراع، ژولیدہ بیانی اور ژرف نگاہی میں اگر کوئی دوسرا نام اردو میں آتا ہے تو وہ ہے خدائے انفرادیت و ژرف نگاہی اسد اللہ غالبؔ کا۔ جون غالبؔ سے زیادہ میرؔ سے متاثر و معترف تھے اور کیوں نہ ہوں، انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور فراقؔ اپنی اپنی جگہ یقیناً ایک اسلوبِ سخن کے موجد کہے جا سکتے ہیں، مگر اتنا original کوئی بھی نہیں جتنے میرؔ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ میر ہی صحیح معنوں میں موجد کہے جا سکتے، باقی تمام لوگ موجد سے زیادہ مجدد ہیں کیوں کہ انھوں نے کسی سابقہ یا رائج الوقت اسلوب کو جداگانہ انداز دے کر اپنے آپ سے مختص کر لیا ہے۔ جون بھی ان معنوں میں موجد نہیں ہیں مگر ان کا مقابلہ وہی غالب والا ہے کہ سابقین میں سے کوئی بھی ان کے اسلوب کے علامتی جہاں کا براہِ راست منبع نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ بات اس لیے اتنی تفصیل سے کہی جا رہی ہے کہ اب کے لوگ form (ہیئت) اور اسلوب کو مدغم کرتے جا رہے ہیں۔ کسی بھی شاعر کے لیے یہ بات باعثِ فخر و طمانیت ہو سکتی ہے کہ اس نے کچھ تخلیقات ایسی پیش کیں جو مواد یا ہیئت یا دونوں اعتبار سے بالکل نئی یا نادر تھیں۔ اس کے کل اثاثے کی نسبت ایسی تخلیقات کا تناسب ہی اس کی عظمت کی دلیل ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ عظمتِ فن خصوصاً عظمتِ شعری اس بات کی متقاضی ہے کہ اس وحدت کو تلاش کرے جو قلزمِ عقل اور بحرِ بے کنارِ حسیات کے اتصال یا سنگم سے وجود میں آتی ہے۔ اس آفاقی توازن universal equilibrium کے موثر ترین اظہار ہی کا نام شاعری ہے۔ غازہ کاری، محدودیت اور عجز، عظمتِ فن کے

ازلی مخالف ہیں۔ منفی اور مثبت اقدار یا خیالات کی تقسیم یا فرقہ بندی، ادب کی معروضیت اور افادیت کو ختم کرتی ہے اور اس unison کو مجروح کرتی ہے جس کی بنیاد پر یہ کائنات اور انسانیت زندہ ہے۔ جون ایلیا ہی نے ایک جگہ ''شاید'' کے بے مثل نثر پارے میں لکھا ہے کہ ''شاعر کا رشتہ صرف جمال سے ہوتا ہے۔'' اور جمالیات کی تعریف میں انھوں نے اخلاقیات کو بھی ضم کر دیا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر اخلاقیات، جمالیات سے کم یا زیادہ ہے تو پھر وہ عقیدہ ہے جس کا تعلق شاعری سے نہیں۔ یہ ایک بڑی دل چسپ اور منطقی تعریف ہے۔ اصل میں تو جون کا یہ دیباچہ بذاتِ خود ایک نادر و نایاب اور کم از کم اس زمانے کی حد تک unique نثر نگاری اور تعقل آمیز جمالیاتی اظہار کا بے مثل شاہکار ہے۔ اس کے جملے اور مفاہیم اپنی ساخت اور اپنی شناخت کے لحاظ سے اتنے نئے ہیں کہ شاید اردو کے بیشتر قاری صرف نظر کی آزمودہ، دیرینہ اور انا گزیدہ پناہوں کی آڑ میں بیٹھ کر صرف غزل اور سہل غزل سے لطف اندوز ہونا مناسب سمجھیں۔ جون کی شاعری سے بیشتر جون کی نثر اور انتہائی فلسفیانہ فکر کی دھوم رہی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ایک اقتباس اس نثر پارے کا اور نقل کیا جائے مگر من و عن تاکہ لوگ اس وحدتِ تخلیق کے پیچھے جو ذہن کارفرما ہے، اُس کا براہِ راست مشاہدہ کر سکیں۔ ایک انتہائی غیر معمولی شاعر اور اُس سے بھی زیادہ غیر معمولی انسان نفسِ شاعری کے بارے میں یوں رقم طراز ہوتا ہے:

> شاعر کی ذات میں فطرت کے ارتقاع کا جمالیاتی بروز ہوتا ہے۔ یہاں شاعر سے ایک ایسا متنفس مراد ہے جس کے نفس میں احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ ہم آہنگ ہو کر ایک تخلیقی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور یہ تخلیقی وحدت، بامعنی صوتی وحدتوں (لفظوں) کی غنائی تالیفات میں صورت پذیر ہو کر شاعری کہلاتی ہے۔

اب رہا خیال یا شعر کا موضوع — تو اس سلسلے میں منطق کا ذکر ناگزیر ہے۔ منطق شعور کی اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ کسی بھی حالت میں اور شعور منطق کے اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ غرض کسی بھی درجے میں۔ یہ گفتگو اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے میں بلکہ تمام معاشروں میں شروع ہی سے شاعری کو الہام یا کہانت سمجھا گیا ہے۔ شاعری کا تعلق اگر پیڑو اور پنڈے سے نہیں ہے بلکہ دماغ سے ہے، ذہن سے ہے تو ذہن کی سب سے اعلیٰ حالت یعنی منطقی حالت کا ذکر ناگزیر ہے۔

منطق جب انتاج اور استناج کے متدرّج عمل میں غیر متدرّج ہو جائے تو مابعد الطبیعیات وجود میں آتی ہے۔ منطق جب انتاج اور استناج کے استخراجی اور استقرائی عمل میں متدرّج رہے تو سائنس وجود میں آتی ہے۔ اور منطق جب احساس کی مکانیت اور زمانیت میں تخیل اور جذبے کے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ صورت پذیر ہو تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ یعنی شاعری کے چار عناصر ہیں، تعقل، احساس، تخیل اور جذبہ۔ جب کہ سائنس بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر صرف احساس سے تعلق رکھتی ہے، مذہب تخیل سے تعلق رکھتا ہے، فلسفہ صرف تعقل سے تعلق رکھتا ہے اور شاعری احساس، تخیل، تعقل اور جذبے (چاروں عناصر) کی جامع ہے۔

ان اقتباسات کو ویسے تو ایک انتہائی خوب صورت نثر کے طور پر پڑھ کر ہی انبساطِ فکر حاصل کیا جاسکتا ہے مگر یہاں پر اس کے نقل کرنے کی اصل غایت یہ ہے کہ لوگ جون کے جوہرِ تخلیق کی منطقی حالت کو سمجھ سکیں۔ یہ محسوس کرسکیں کہ جس وحدتِ تخلیق یا تخلیقی

وحدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ جون کے یہاں اور ان کے قبیل کے تمام شعرا کے یہاں کتنی شفافیت (transparency) کے ساتھ جلوہ فرما ہے اور ایک منضبط فکری رویے کی طرح شاملِ عملِ تخلیق ہے۔ چاہے اظہار نثر میں ہو یا نظم میں، یہ رویہ خونِ رگِ جاں کی طرح جاری وساری ہے۔

جون نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ دوآبۂ گنگ وجمن کے حالت خیز، رمزیت آمیز اور دل انگیز شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ یہ حالت خیزی، رمزیت آمیزی اور دل انگیزی ان کی شاعری اور تخلیقی کاوشوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ چاہے غزل کہہ رہے ہوں یا نظم، وہ originality کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کچھ مثالیں:

نظر پہ بار بن جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو، وہاں اکثر نہ رہیو
ہر اک حالت کے بیری ہیں یہ لمحے
کسی غم کے بھروسے پر نہ رہیو

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

آپ اپنی گلی کے سائل کو
کم سے کم پُر سوال تو رکھیے

ہے عجب فیصلے کا صحرا بھی
چل نہ پڑیے تو پاؤں جلتے ہیں

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نہیں
کوئی دم چین پڑ جاتا مجھے بھی
مگر میں خود سے دم بھر کو جدا نہیں

تھے عجب دھیان کے در و دیوار
گرتے گرتے بھی اپنے دھیان میں تھے

ہے جو پُر خوں تمہارا عکسِ خیال
زخم آئے کہاں کہاں جاناں

خود نگرانِ دل زدہ، دل زدگانِ خود نگر!
کوچۂ التفات سے خود نگراں گزر گئے
کیا وہ بساط الٹ گئی، ہاں وہ بساط الٹ گئی
کیا وہ جواں گزر گئے، ہاں وہ جواں گزر گئے

حیف درازی اس قصے کی اس قصے کو ختم کرو
کیا تم نکلے اپنے گھر سے، اپنے گھر سے ہم نکلے

کتنی آنکھیں ہوئیں ہلاکِ نظر
کتنے منظر نہیں رہے آباد

کیا ہوئے آشفتہ کاراں کیا ہوئے
یادِ یاراں، یار، یاراں کیا ہوئے
سو رہا ہے شام ہی سے شہرِ دل
شہر کے شب زندہ داراں کیا ہوئے
اس کی چشمِ نیم وا سے پوچھیو
وہ ترے مژگاں شماراں کیا ہوئے
کیا ہوئے صورت نگاراں خواب کے
خواب کے صورت نگاراں کیا ہوئے

کہاں تک لکھا جائے، کہاں تک مثال دی جائے۔ غزل کی غزل، انتخاب اور نظم کی نظم گنجینۂ افکار ہے۔ جون ایلیا جہاں جمالیات اور اخلاقیات کی گفتگو کرتے ہیں اور منطقی حوالوں سے مختلف علوم اور شاعری کی درجہ بندی کرتے ہیں، وہاں وہ یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں، ''شاعری ایک دُہرا انسان چاہتی ہے''، ''شاعری ہی وہ فن ہے جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو ہم عصر بناتا ہے'' یا ''مابعد الطبیعی حقائق کے شاعر، شاعر سے بلند مرتبے کے حق دار تو ہوسکتے ہیں مگر شاعر نہیں ہوسکتے۔'' ''شاعر کا سب سے گہرا رشتہ جمال سے ہوتا ہے اور جمال غیر زمانی اور غیر مکانی نہیں ہوتا۔'' اب اگر شاعری ایک ایسا فن ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو ہم عصر بناتا ہے اور شاعر کا سب سے گہرا رشتہ جمال سے ہے اور جمال زمانی و مکانی ہے تو کیا یہ دوسرے لفظوں میں اس بات کا اعادہ نہیں ہے کہ مابعد الطبیعیاتی نظام یا فکر ہی جمال کی اوّلین، ازلی یا ادبی حالت ہے۔ مگر وہ اس سے گریز نہیں کرتے بلکہ جہاں وہ مابعد الطبیعیاتی شاعری کو ماسوا شاعری کوئی اور چیز کہتے ہیں، وہ غالباً عقیدہ پرستی، اثباتی اور منطقی اثباتیت کی ادعائی شاعری سے گریز کرتے نظر آتے ہیں اور اس شریفانہ اعتراف اور تہذیبِ نظر کے حامی ہیں کہ دلیل ولیل شاید کچھ نہیں، وہ تو ایک تاریخی، سماجی اور نفسیاتی تکییف (conditioning) ہوتی ہے جو کسی رائے اور مسلک کو اختیار کرنے کا

رجحان پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک بہت صحت مند اور مہذب اندازِ فکر ہے۔ وہ شاعری کے حوالے سے اس کو بدتہذیبی یا بددیانتی گردانتے ہیں جہاں اپنے اختیار کردہ اندازِ فکر کو یا رائے کو اوروں پر تھوپنے کی کوشش کی جائے یا اس بنیاد پر تخصیص و تقسیم کی جائے، ورنہ ان کی شاعری کا سارا سارا خمیر ہی ان ازلی اور ابدی غیر معمولی اور نامحسوس توجیہات سے اٹھا ہے مگر وہ بشریت اور ارضیت کے قائل ہیں۔ اس کا اظہار جا بجا ان کے اشعار میں موجود ہے۔ جا بجا انھوں نے حق اور خدا کے تفاوت کو موضوع اور ادعائیت کو ہدف بنایا ہے:

کون سا قافلہ ہے یہ جس کے جرس کا ہے یہ شور
میں تو نڈھال ہوگیا، ہم تو نڈھال ہوگئے
سایۂ ذات سے بھی رَم، عکسِ صفات سے بھی رم
دشتِ غزل میں آ کے دیکھ ہم تو غزال ہوگئے

مجھ سے میرا سراغ کیوں کہ یہ کام
میں ترے نقشِ پا کے سر چاہوں
اب تو اس سوچ میں ہوں سرگرداں
کیا میں چاہوں بھلا اگر چاہوں

پہنائی کا مکان ہے اور در ہے گم یہاں
راہِ گریز پائی صرصر ہے گم یہاں
ہیں صفحۂ وجود پہ سطریں کھنچی ہوئی
دیوار پڑھ رہا ہوں مگر در ہے گم یہاں

خدا نہیں ہے تو کیا حق کو چھوڑ دیں اے شیخ
غضب خدا کا، ہم اپنے امام کے نہ رہیں

ہم نے خدا کا رد لکھا نفی بہ نفی، لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں
اے خدا (جو کہیں نہیں موجود)
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نہیں

جون ایلیا پر کوئی گفتگو سیر حاصل اور کوئی تحریر معتبر نہیں ہو سکتی جب تک ان کی غیر معمولی کاوش، ''رمزِ ہمیشہ'' کا ذکر نہ ہو۔ مجھے یاد ہے جب جون بھائی گزشتہ مرتبہ کیلگری آئے تھے اور ہماری بہت ساری one on one رات گئے کی محفلوں میں اس نظم کا تذکرہ چھڑ گیا تھا۔ میں نے تعریف کی تو بہت خوش ہوئے اور کہا، ''تجھے یہ نظم پسند ہے تو بتا کیوں پسند ہے؟'' میں نے عرض کیا، ''یہ آپ کے نظامِ فکر کی نمائندہ تخلیق ہے، کم از کم 'شاید' کے حوالے سے۔'' مزید خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ ''نظم نکالو۔'' میں نے ''شاید'' میں وہ صفحات نکالے۔ قلم لیا اور نظم کے مختلف حصوں کو انڈر لائن کرنے لگے (جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے)۔ اس کے بعد کہا، ''اس نظم میں، میں نے بہت سے ایسے ٹکڑے اور بند شیں

استعمال کی ہیں جو آج سے پہلے کسی نے اردو میں استعمال نہیں کیں۔ یہ تو خیر ایک بات تھی جو اچانک یاد آ گئی مگر اس نظم کی حد تک یہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ جون ایلیا کے اس بیان کی واضح تصدیق ہے کہ جب احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ ہم آہنگ ہو کر ایک تخلیقی وحدت بن کر بامعنی ہوتی وحدتوں میں صورت پذیر ہوتے ہیں تو یہ شے شاعری کہلاتی ہے۔ میں اپنے اس مضمون کو اسی اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔

اور پھر

وہ زمانہ بھی آیا کہ جب
میں ترے باب میں مضمحل ہو گیا
بادِ یغما گرِ نفی و انکار نے
اُن فرحناک اسرار کے
عالمِ خواب آگیں کو زیر و زبر کر دیا
وہ خجستہ وہ خوش ماجرا روز و شب
وہم و خواب و خیال و گماں ہو گئے
وہ معانی وہ احوالِ جاں آفریں
بے اماں ہو گئے
فیضِ توفیق کی
وہ رسد رُک گئی
وہ یقیں کے اُفق
بے نشاں ہو گئے
جو بھی آسان تر تھا وہ دشوار تر ہو گیا
میری حالت یہ تھی

جیسے میں اک سفر کردۂ دور افتادہ ہوں
اور ایقانِ فرخندہ و برگزیدہ کی وہ سرزمیں
میرے لمسِ کفِ پا سے
قرنوں کی دُوری میں
گم ہو چکی ہے
میں تنہا ہوں
بے چارہ ہوں

تب میں نے گزرے زمانوں میں
اور آنے والے زمانوں میں فریاد کی
اے خدا!
اے خداوند!
اب مرا باطنِ ذات ویران ہے
اب درونِ دروں
اور بیرونِ بیروں
فقط اک خلا ہے
فقط ایک لا

دہر دہر اور دیوم دیوم میں
اب عدم در عدم کے سوا کچھ نہیں
اے خداوند تو کیا ہوا
مجھ کو تیرے نہ ہونے کی عادت نہیں

وائے بر حالِ ژرفا و بالا و پہنا!
دریغا! سب ہر مسبّب سے اپنے جدا ہو گیا
حسرتا! کہکشاؤں کے گلّوں کا چوپان کوئی نہیں

اور پھر میں نے
موجود کے دائرے کی نہایت پہ نالہ کیا
اے یقیں کے گماں
اے گماں کے یقیں
اے ازل آفریں
اے ابد آفریں
اے خدا الوداع
اے خدایاں خدا
الوداع، الوداع

''رمزِ ہمیشہ'' صرف ایک نظم نہیں، یہ ایک ازلی اور دائمی کیفیت کا اظہار ہے۔ یہ نہ انکار ہے، نہ اقرار — اگر کچھ ہے تو بیک دونوں ہے۔ تلاش، جستجو اور ناگزیریت کی ایک رِستی ہوئی جمالیاتی تجسیم ہے۔ یہ انسانی شعور کی اُس ابدی خلش سے قرار پانے کی خواہش ہے جس کے نہ ہونے کی ہمیں عادت نہیں ہے اور وہ شاید ضروری بھی نہیں ہے جیسا کہ ہیگل نے کہا کہ ''حقیقت اور اس کے پرتو کی تقسیم صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ ہم نے خارجی مادے اور تصور کرنے والے ذہن کو دو الگ الگ اکائی تصور کر لیا۔ حالاں کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ ''شعور'' حقیقتِ کبریٰ ہے اور مادہ و خارج وغیرہ اس کے مختلف مدارج۔ فی الحقیقت وجود صرف شعور ہی کا ہے، چاہے آپ اسے ''پرتو'' جان لیں یا

"حقیقت۔" یعنی اب جس سے فرار مقصود ہے، وہی عینِ نسب ہے۔ یہ "ہونے" اور "نہ ہونے" کی بحث نہیں ہے، یہ سراسر "ہونے" پر اصرار ہے مگر اس کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ شعور کے ملگجے اجالوں کی طرف لے جانے کے ساتھ شعور کے بالذات ہونے اور شعور کے متغیر ہونے کے اثرات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ شعور کا مسئلہ انسانی فکر سے ازل سے الجھتا رہا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے، چاہے شعور مادہ ہو یا روح یا حیات کی مقدس ترین اکائی ہے اور اس کا تحرک دائرائی ہے مگر شعور کو بالذات اکائی ماننے والے کائنات کی روحانی یا روحانیاتی تعبیر کرتے ہیں اور مادی تعبیر کرنے والے اس کو ایک تغیر آمیز شکل قرار دیتے ہیں۔ بظاہر دیکھیں تو اس کا واسطہ ہماری زندگیوں سے نہیں معلوم ہوتا اور یہ ایک طرح کی مکتبی بحث ہے۔ مگر دراصل اس کا بہت گہرا تعلق ہماری زندگیوں سے ہے اور زمانے سے رہا ہے، کم از کم اس زمانے سے تو ہے جب سے باقاعدہ منظم مذاہب کا دور دورہ ہوا۔ اب ان مذاہب اور ان کے اثرات نے کیا کیا گل کھلائے اور کھلا رہے ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ دراصل تاریخِ عالم کی سب سے بڑی استحصالی اکائی یا قوت یہ مذاہب ہی رہے ہیں اور انھی کا سہارا لے کر دیگر استحصالی قوتوں نے اپنے تسلط کا جواز پیدا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔ جون ایلیا یا اس قبیل کے تمام لوگ جو اس تقدس مآب تصور کو زیر بحث لاتے ہیں، وہ اس کی ناگزیریت کی بیخ کنی کر کے زندگی اور انسان کے مدارج بلند کرتے ہیں۔ اوتاریت (Dogmatic) طرزِ فکر کا خاصہ یہ ہے کہ چیزوں کو تقدس سے سرفراز کر کے دائرۂ کلام سے خارج کر دو۔ خوشا ہیں وہ لوگ وہ ہستیاں جو ہر معنی کو لفظ کے سانچے سے سرفراز کرتے ہیں اور فکر کو ناطق بناتے ہیں۔ یہ خوف زدہ حصار اگر ٹوٹے گا تو انھی کوششوں سے ٹوٹے گا اور یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھٹے گا تو اسی فیضانِ نظر سے چھٹے گا۔ اب چاہے غالبؔ ہوں یا جوشؔ، اقبالؔ ہوں یا فراقؔ، جونؔ ہوں یا راشدؔ — سب نے اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی ہمت کے لحاظ سے چیزوں کو برتا ہے اور ادراک کی تہوں کو کریدا ہے اور نطق کو

سرفراز کیا ہے۔ علت العلل کو تسلیم کر لینا بھی تعلیل کی ہمہ گیری کو منوا لینا ہے۔ اب اس کو متشخص کرنا نہ کرنا ایک ترجیحاتی رجحان ہے، چاہے کائنات حادث ہو یا قدیم، وہ اپنے اعتبار اور اثبات کے لیے شعور کی مرہونِ منت ہے۔ ظاہر ہے، ہر شے اور رجحان ساز فکر اپنی عبوریت پہ دلالت ہے۔ علمائے یونان نے قبلِ مسیح اس بات کو پا لیا تھا کہ صرف تغیر کو ثبات حاصل ہے اور اس کو اقبالؔ نے اپنے مشہور زمانہ مصرعے میں اپنا لیا۔

جون اور اس کی قبیل کے تمام تخلیق کار، فن کار، صورت گر اور عالمِ معانی کے وارث اپنی تخلیقی جوہریت کی ہمہ گیریت میں زندہ ہیں، یہی زندگی کا شیوہ ہے اور یہی مبہوتیت ہر پائندگی کا قرینہ۔ اقرار و انکار ایک ذیلی اور فروعی بحث ہے جو قدرے اضافی ہے:

میں کثرتِ ظہور سے نادیدنی ہوں جونؔ
میں شدتِ وجود سے ناآفریدہ ہوں

○

جون ایلیا — طرزِ زیست اور وضعِ سخن

جون ایلیا شاعر تھے — اوّل و آخر، ظاہر و باطن شاعر۔ اس بات کے معانی ہر وہ شخص باآسانی سمجھ سکتا ہے جس نے محض ایک بار اور چاہے مختصر دورانیے کے لیے ہی اُن کی صحبت اُٹھائی ہو۔ اپنے مخصوص طرزِ زیست اور خاص اُفتادِ طبع کے باعث وہ ملنے والے پر جو تأثرات مرتب کرتے تھے، ان میں پہلا اور سب سے گہرا تاثر اُن کے شاعر ہونے ہی کا تھا۔ وضع قطع، نشست و برخاست، طرزِ اظہار، اندازِ تکلم غرضے کہ ہر طور اُن کے شاعر ہونے کا مظہر تھا، بالکل اُسی طرح جیسے جاڑوں کے کُہن اگل سے اس کی پہچان کرا دیتے ہیں یا پھر جیسے مٹی کو سوندھاپن دینے والے بادلوں کے مشکیزے خود اپنا پتا دیتے ہیں۔

جون صاحب کی بابت یہ تاثر کچھ ابھی کی بات نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سے ۱۹۹۳ء میں ہونے والی پہلی بالمشافہ ملاقات کی ابتدائی ساعتوں میں ہی یہ تاثر قائم ہوگیا تھا۔ یہ ملاقات جمال احسانی کے گلشنِ اقبال والے فلیٹ پر ہوئی تھی، جہاں ہم جمال پانی پتی صاحب کے ساتھ پہنچے تھے۔ جون صاحب پہلے سے براجمان تھے بلکہ یوں کہیے کہ بیڈ پر نیم سے کچھ سوا دراز تھے۔ جمال پانی پتی صاحب سے بیڈ پر گھٹنوں کے بل کھڑے ہوکر

وہ گلے ملے اور شکایت کی، بہت زمانوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ پھر جیسے انھوں نے ذہن پر زور دیا، اک تامل کیا اور کہا، ''یاد کر رہا ہوں کہ آخری ملاقات کس صدی میں ہوئی تھی۔'' جمال پانی پتی صاحب نے تعارف کرایا، ''یہ مبین مرزا ہیں۔''

''ہاں، ہاں جانی آؤ، آجاؤ، خوب آئے۔'' جون صاحب نے کچھ ایسے تپاک اور والہانہ پن سے کہا، جیسے عمر بھر کی ملاقاتیں ہیں اور گویا آمد کے منتظر ہی تو تھے۔ بیڈ پر ایک طرف کو سرکتے ہوئے انھوں نے جگہ بنائی اور بولے، ''تو بھئی شعر کہتے ہو تم۔'' یہ استفسار نہیں، بیان تھا اور پورے تیقن کے ساتھ۔ اِدھر بے حد حیرانی کہ وہ ہماری شعرگوئی سے کیوں کر واقف ہیں۔ جون صاحب نے اس حیرت کو بھانپ لیا تھا اور اب وہ جمال پانی پتی صاحب سے کہہ رہے تھے، ''بھئی شعر تو ہیں اس عزیز کی آنکھوں میں۔''

''پیارے صاحب! یہ مغل بچہ ہے، اس کے دماغ میں چنگیز خانی خناس بھی ہے۔'' جمال احسانی نے ٹکڑا لگایا۔ جون صاحب نے جیسے سنا ہی نہیں، اپنی رو میں بولے، ''مگر پیارے! شاعری خون تھکوا دیتی ہے آدمی کو۔'' یہ کہتے ہوئے خدا جانے وہ کس سے مخاطب تھے، جمال پانی پتی صاحب سے، جمال احسانی سے، ہم سے یا خود سے یا پھر کسی اور نادیدہ مخلوق سے۔

جوانی، نوجوانی کے دنوں میں آدمی میں اثر لینے کی صلاحیت خوب ہوتی ہے۔ جون صاحب کی شاعری سے ہم پہلے بھی واقف تھے بلکہ اس کے قائل تھے۔ اب جو ملاقات ہوئی تو اُن کی وارفتگی، محزونی اور خودمحویت نے بھی گھائل کیا۔ گویا ایک نقش ہی تو بیٹھ گیا۔ جون صاحب سے اس کے بعد یوں تو اور بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ان میں کچھ لمحات تو ایسے یادگار گزرے ہیں جو تادمِ آخر حافظے کے اُفق پر فروزاں رہیں گے، مثلاً وہی ملاقات جب مشتاق احمد یوسفی صاحب نے چند شاعر دوستوں (جون ایلیا، پیرزادہ قاسم، فاطمہ حسن، ہم اور دوسرے چند احباب) کو بلا بھیجا تھا۔ اس ملاقات میں جون

صاحب سے اُن کے منہ چڑھے دوستوں، بے تکلف نیازمندوں اور چہیتے مداحوں کی گفتگو کا خاص موضوع ان کی دوسری شادی کی خواہش تھی۔ کیا کیا شگوفے چھوڑے جارہے تھے۔ یہ محفل اور اس میں ہونے والی باتیں۔۔۔ سب کچھ جیسے ایک واقعہ تھا جسے ہم نے وقوع پذیر ہوتے دیکھا۔ سچ پوچھیے تو ایک یہی کیا، ان سے تو ہر ملاقات ایک واقعہ ہوجاتی تھی، لیکن ہماری طرف سے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بوجوہ کبھی باقاعدہ اور تواتر سے نہ چلا۔ تاہم دل و دماغ نے ان کے سراپا شاعر ہونے کا جو تاثر اوّل اوّل قبول کیا تھا، وہ آخر آخر تک قائم رہا بلکہ آج بھی ہے۔ یہ الگ بات کہ اُن کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی کے بارے میں رائے ماہ و سال کے گردش میں رہنے والے اس چاک پر ترمیم و تنسیخ کے کتنے ہی مراحل سے گزری۔ اور کیوں نہ گزرتی کہ خرامِ عمر ہمارے خارجی آثار ہی نہیں، داخلی افکار کی بھی قلبِ ماہیت کرتا چلا جاتا ہے۔ دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کے مصداق وقت اپنی رَو میں رواں رہتا ہے اور اپنی راہ میں آنے والی اشیا و افراد کو روندتے ادھیڑتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ کہنے والے رئیس فروغ کی طرح ہزار للک سے کہتے رہ جاتے ہیں:

خرامِ عمر ترا کام پائمالی ہے
مگر یہ دیکھ ترے زیر پا تو میں بھی ہوں

ہم جون صاحب کی شخصیت پر نہیں لکھ رہے، لکھنا بھی نہیں چاہتے کہ یہ کام ان کے قریبی دوستوں اور شبانہ روز صحبت داروں کے کرنے کا ہے۔ سو ہم یہاں اُن کے شخصی احوال کی گفتگو کو طول نہیں دیتے۔ تاہم ہر فطری تخلیق کار کی طرح جون صاحب کے ساتھ بھی ماجرا یہی ہے کہ اُن کے فن کو شخصیت سے مطلقاً الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ یوں بھی معروضیت کا یہ مطلب نہیں ہوتا، ہو ہی نہیں سکتا کہ آدمی اپنے فطری داعیے سے دست بردار ہوجائے۔ ہر فن کار فطرت سے ایک جوہر لے کر آتا ہے جو اس کی شخصیت

میں مرکزے کا کردار ادا کرتا ہے۔ اسی کے گرد اس کی ذات و حیات اور فکر و نظر کے تمام اجزا کھنچتے یا اکٹھے ہوتے ہیں۔ اسی سے اُس کے فن کی نمود ہوتی ہے۔ جون ایلیا ان فن کاروں میں ہیں جن کی ذات اور ہنر دونوں بدیہی طور پر اسی مرکز سے جڑے اور نمو پاتے نظر آتے ہیں۔ ایسے فن کاروں کا مطالعہ بادی النظر میں جتنا سہل معلوم ہوتا ہے، اتنی ہی نزاکت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شخصی میلانات قدم قدم پر التباس کے امکانات پیدا کرتے ہیں۔ بسا اوقات یہ امکانات اتنے قوی ہوتے ہیں کہ اک ذرا سی لغزش یا بے احتیاطی ایسے فن کاروں کی اصل سے ہماری توجہ ہٹا دیتی ہے۔ محسوس یوں ہوتا ہے کہ جون صاحب کے سلسلے میں ہمارے یہاں یہی ہوا ہے۔ عوامی سطح پر ہی نہیں اہلِ فکر و نظر کی سطح پر بھی۔ مستثنیات کی بات الگ ہے۔ تاہم یہ صورتِ حال جون صاحب کے حوالے سے خاصے بڑے پیمانے پر نظر آتی ہے۔ چناں چہ آج جب ہم ان کے فن کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اُن کی شخصیت کا پرتو یا بعض ذاتی عناصر اُس کی تفہیم کے لیے حجاب بن جاتے ہیں۔ ایک ایسا حجاب جو انھیں قصے کہانیوں، من گھڑت باتوں اور بے سروپا آرا کے مرغولوں میں لپٹا ہوا پیش کرتا ہے۔ یوں وہ ایک دیومالائی کردار بن جاتے ہیں اور ہم جتنے منہ اُتنی باتیں کے مصداق، ان کے بارے میں لوگوں سے طرح طرح کی گفتگو سنتے ہیں۔ خیر، یہ کوئی اَن ہونی بھی نہیں۔ اس لیے کہ خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگتی ہی ہے مگر یہاں خود جون صاحب کی اُفتادِ طبع بھی اس صورتِ حال کو بنانے اور اسے ایک طرح کا طلسماتی رنگ دینے میں بے حد مؤثر کردار ادا کرتی ہے — اور کیوں نہ کرتی کہ جون صاحب نے تو اواخرِ عمر تک رومان پسندوں کی طرح بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا کے مطمحِ نظر کو حرزِ جاں بنائے رکھا۔ وہ حرفِ سخن کے فروغ اور معنی کی ترسیل میں شاعر کی شہرت (اچھی بری کسی بھی طور) کی اہمیت کے قائل تھے۔ یہی سبب ہے کہ ہم ان کی شخصی بوالعجبیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اُن کے اس نظریے کی

تصدیق کرتی ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ اُن کی شاعری اپنے عوامی نفوذ تک کے مرحلے میں ایسے کسی خارجی سہارے کی قطعی طور پر محتاج نہیں تھی۔ یہ شاعری معانی اور طرزِ ادا، دونوں سطحوں پر اپنے ابلاغ کی داخلی اور وافر قوت رکھتی ہے۔

جون ایلیا کی شاعری کی بابت اتنی بات تو کسی بحث و تمحیص کے بغیر بھی طے ہوسکتی ہے کہ وہ مزاجِ سخن کے اعتبار سے جذبہ و احساس کے شاعر ہیں اور یہ کہ اُن کی شاعری کی بنیاد نفی کے احساس پر منحصر ہے۔ تاہم گفتگو کے اسی مرحلے پر ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ وہ نفی و استرداد کی اس منزل تک تامل و تشکیک کے جاں کاہ مراحل سے گزر کر نہیں پہنچے تھے بلکہ اُن کے یہاں یہ ایک خلقی کیفیت ہے، ایک طبعی اور فطری رُجحان ہے جو اظہار کا پیرایہ اور سخن کا اسلوب وضع کرتا ہے۔ احساس کی یہ وہ کیفیت ہے جس کی چھوٹ اُن کے یہاں انفس سے لے کر آفاق اور اس سے بھی آگے خدا تک پڑتی دکھائی دیتی ہے — یعنی یہ ایک مستقل رویہ ہے جو اُن کی ذات کے داخلی عناصر اور میسر آنے والی کائنات کے خارجی عوامل میں یکساں نفوذ رکھتا اور ظہور کرتا ہے۔ یہاں گھڑی بھر رُک کر جون ایلیا کے بہت معروف محض چند شعر مثالاً دیکھ لیجیے تاکہ بات کی وضاحت ہوسکے:

ہماری ہی تمنّا کیوں کرو تم
تمھاری ہی تمنّا کیوں کریں ہم

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

ہم نے خدا کا رد لکھا نکتہ بہ نکتہ لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں

اب یہ ہے کہ پروفیسروں کی طرح 'شاعر یہ کہہ رہا ہے...' والے استادانہ اور مدرسانہ انداز میں اشعار کی تشریح سے ہمیں بالکل دل چسپی نہیں، سو یہ کام آتا بھی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ لکھنے والے کو اپنے قاری کی صلاحیت اور بصیرت پر اعتماد بھی کرنا چاہیے۔ چناں چہ ہم اشعار کی تشریح وشرح کے چکر میں پڑنے کی بجائے شاعر کے احساس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے پس منظر میں کارفرما ذہنی رَو کو دیکھتے ہیں یہ جاننے کے لیے کہ وہ شاعر کے ماجرے کو کس رُخ سے اُجاگر کرتی ہے۔

ان اشعار کی پہلی قرأت میں ہمیں زبان کی سادگی اور بیان کی لطافت سے لے کر صنعتِ تضاد اور ڈرامائیت تک ان میں جانے کیا کیا نظر آتا ہے لیکن دوسری تیسری قرأت کے بعد جس ایک چیز پر ہماری توجہ مرکوز ہوتی ہے، وہ نفی کی کیفیت ہے جو ان سب اشعار میں زیریں برقی رو کی طرح دوڑتی چلی گئی ہے۔ نفی کی یہ رَو جون ایلیا کے احساس کا وہ رُخ ہے جو اُن کے رنگِ سخن کا تعین کرتا ہے۔ ان اشعار میں فن کار کا اپنی ذات سے، اپنے جذباتی مراسم سے، سماجی روابط سے، اس کائنات سے اور خدا سے جو تعلق ہمارے سامنے آتا ہے، وہ ایک مسلسل اور محکم نفی پر منحصر ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے بیان تو صرف خدا کا رد لکھنے کا دیا لیکن واقعتاً یہ رد اُن کے یہاں اپنی

ذات سے پوری کائنات کو محیط ہے۔ کیا کوئی رشتہ، کوئی کیفیت، کوئی جذبہ، کوئی خیال، کوئی فکر یا کوئی شے ایسی بھی ہے جس کا اثبات ہمیں اُن کے یہاں ملتا ہو؟ نہیں، کوئی ایک بھی تو نہیں۔ یہاں تو پیہم نفی ہی کی عمل داری ہے۔

جون ایلیا کے کلام کی کتابی صورت میں تدوین ایک تو ہوئی بہت تاخیر سے دوسرے وہ زمانی ترتیب سے عاری ہے۔ چناں چہ ان کے پانچوں مجموعہ ہائے کلام "شاید"، "یعنی"، "لیکن"، "گویا"، "گماں" کو ترتیب سے پڑھنے کے باوجود اُن کے ذہنی سفر کے بارے میں کوئی بات واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں آتی — بلکہ دیکھا جائے تو سخت تعجب ہوتا ہے کہ پہلا مجموعہ "شاید" جو اُن کی زندگی میں شائع ہوا تھا، بہر اعتبار ان کا نمائندہ مجموعۂ کلام نظر آتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا مجموعہ "یعنی" بھی کچھ بہتر ہے لیکن اس کے بعد صورتِ حال وہ نہیں رہتی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ بعد کے مجموعے اس معیار و اعتبار کو برقرار رکھتے نظر نہیں آتے جو "شاید" کی اشاعت سے جون ایلیا کے لیے بحیثیت شاعر قائم ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد جون ایلیا کے سنجیدہ قارئین اور مخلص احباب کے حلقے میں یہ سوال نہایت سنجیدگی سے اٹھا کہ یہ مجموعے کس ضرورت کے تحت مرتب کیے گئے ہیں اور یہ کہ اگر جون ایلیا زندہ رہتے تو کیا وہ اس سارے کلام کی بعینہٖ اشاعت پر آمادہ ہوتے؟ اس سوال کے سارے ممکنہ جوابات اب محض قیاسی نوعیت کے ہیں، لہٰذا اس بحث وتمحیص میں اُلجھنا کسی کام کا نہیں۔ اب تو جو کچھ ہمیں فراہم ہے، اسی کی بنیاد پر جون ایلیا کی شاعرانہ شناخت اور فن کارانہ قد و قامت کا تعین ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں برنارڈ شا کے بیان کردہ اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ فن کار کی قدر و قیمت کا تعین اس کے فن کی اعلیٰ ترین سطح کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔

تو ہم بات کر رہے تھے جون ایلیا کے طرزِ احساس کی جو مسلسل نفی کی صورت اپنا اظہار کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نفی کا یہ احساس اُن کے یہاں اپنی بنیاد کس شے

پر رکھتا ہے؟ کیا یہ بعض ذہنی تحفظات کا نتیجہ ہے جو ہر شے کی نفی پر مصر ہیں یا وجودی رُجحانات یا تجربات کا حاصل ہے؟ کیا اس شاعرانہ کیفیت کے پس منظر میں فلسفۂ وجودیت کے اثرات کارفرما ہیں یا پھر متشکّکین کے اٹھائے ہوئے سوالات و مباحث شاعر کی اس ذہنی ساخت کا سبب بنتے ہیں؟ کیا نئے پرانے فلسفے کی بحثوں اور الجھنوں نے شاعر کے مزاج کی اس تشکیل میں کوئی کردار تو ادا نہیں کیا؟ کہیں اپنی کسی داخلی رَو کے زیرِ اثر شاعر نے زندگی اور کائناتِ انسانی کو اُس منزل میں تو دریافت نہیں کیا جسے صوفیہ کی اصطلاح میں ''ترکِ دنیا'' کہا جاتا ہے کہ پھر اُس کے یہاں زندگی کبھی بار ہی نہ پا سکی، قبولیت کی سطح تک ہی نہ آسکی؟ ان سارے سوالوں کا ایک ایک کر کے جواب ہمیں جون ایلیا کی شاعری نفی میں فراہم کرتی چلی جاتی ہے۔ جی جناب، بالکل نفی میں۔ یعنی اُن کے یہاں اس نفی کی بنیاد کسی فلسفے یا نظریے، کسی خیال یا سوال، کسی ذہنی یا وجودی تجربے پر ناگزیر طور پر نہیں ہے۔ حالاں کہ ''شاید'' کے مفصل ابتدایے میں جو ''نیازمندانہ'' کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے، جون ایلیا نے وجودیت اور مارکسیت کی طرف اپنے ذہنی جھکاؤ کا صاف اظہار کیا ہے بلکہ لاادریت کی طرف بھی اور ایک تاثر اپنی تشکیکی کیفیت کا بھی دیا ہے لیکن یہ ساری گفتگو ایک آراستہ اور دل پذیر بیان کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی شاعری اُن کے اس بیان پر اُس طرح شہادت نہیں دیتی جس طرح خون میں تحلیل ہو جانے والے مسائل کے بارے میں فن کار کا ہنر اندر کی گواہی بہر گام فراہم کیا کرتا ہے۔

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا عناصر اُن کے یہاں پائے تو جاتے ہیں لیکن اُن کے فکر و فن کی بنیاد ان میں سے کسی پر نہیں۔ یعنی شاعر نے وقت اور تجربے کے ساتھ ان سب کو بھی احساس کی رَو میں سمیٹا تو بے شک ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک اس کے فکر و نظر کے اصلِ اصول کا درجہ نہیں رکھتا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ آخر نفی کے اس رویے کی بنیاد ہے کیا؟

یہ ایک ذرا سا پیچیدہ اور غور طلب معاملہ ہے۔ جون ایلیا ایک تہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ یہ تہ داری فطری داعیے کی سطح پر بھی تھی اُن کے یہاں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جس تہذیبی و سماجی سیاق میں اُن کی ذہنی تربیت اور شخصی ساخت پرداخت ہوئی اُس کے دائرے میں بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نمو پذیری کے ابتدائی دورانیے ہی کے کسی مرحلے پر ذہنی تنہائی کے شدید احساس نے انھیں آلیا تھا۔ تاہم عمر کے توانا برسوں میں چوں کہ قویٰ آدمی کو آسانی سے اضمحلال کا شکار نہیں ہونے دیتے، اس لیے جون ایلیا کے یہاں تنہائی کا یہ احساس اس وقت شدت سے اُجاگر نہیں ہوا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اور زندگی سے حاصل ہونے والے تجربات کے زیرِ اثر یہ احساس اُن کے دل و دماغ کو اوکٹوپس کی طرح اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت تک ان کے یہاں انفرادی امنگیں اور اجتماعی خواب نظر آتے ہیں۔ تبدیلی، ارتقا اور انقلاب کی خواہشیں بھی رگوں میں گردش کرتی محسوس ہوتی ہیں — لیکن رفتہ رفتہ یہ خواب اور خواہشیں ماند پڑتی چلی جاتی ہیں۔ تب ایک سانحہ ہوتا ہے جس سے اُن کی پوری شخصیت کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ وہ جو اُن کے اندر کا آدمی تھا، وہ اس تنہائی، وقت کی قید اور تقدیر کے جبر کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ایسی کوئی اَن ہونی بات بھی نہیں۔ بڑے بڑے سورماؤں نے زندگی کے ہاتھوں کسی نہ کسی مرحلے پر یہ ہزیمت اٹھائی ہے لیکن جون ایلیا کے ساتھ المیہ یہ گزرتا ہے کہ وہ اس شکستِ احساس اور تنہائی کے تجربے سے لذت کشید کرنے لگتے ہیں۔ وہ اضمحلال کا شکار ہو کر خاموش ہونے کی بجائے بہ بانگِ دہل اس کے تذکرے سے لطف حاصل کرنا پسند کرتے ہیں۔ وقت کی یلغار کو سینے پر مردانہ وار سہارنے کی بجائے وہ گریہ کر کے اور واویلا مچا کر اٹھائے ہوئے زخموں کی نمائش ضروری سمجھتے ہیں — اور جب ایسا ہونے لگتا ہے تو دیکھنے والوں کا ہجوم اطراف میں جمع ہوتا چلا جاتا ہے۔ تب آدمی مجمعے کی توجہ کا مرکز بننے پر خود کو دوسروں سے برتر محسوس کرتا ہے۔

لیکن افسوس کہ بات یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔ اب وہ جان لیتا ہے کہ جب تک تماشا جاری ہے، تب تک مجمع قائم ہے۔ تماشا نہ ہوگا تو مجمع ڈھل جائے گا۔ تب وہ رہ رہ کر اپنے زخموں کی مبالغہ آمیز نمائش ہی نہیں کرتا بلکہ اس مجمعے کو قائم رکھنے کے لیے خود کو اپنے ہی ہاتھوں زک بھی پہنچانے لگتا ہے۔ یہی سانحہ شاعر جون ایلیا کے ساتھ گزرا ہے۔

تو کیا جون ایلیا کی ساری شاعری میں انسانی احساس اور تجربے کی سچائی کا کوئی عنصر موجود نہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر اسے فن کی اُس ذیل میں کیوں کر رکھا جاسکتا ہے جس کا حسن، خیر اور سچائی سے ربط ہوتا ہے؟ اصل میں یہی تو ادب و فن کے معاملے کی نزاکت ہے کہ اسے بہ یک قلم یوں مسترد کیا جاسکتا ہے اور نہ قبول۔ معاملہ رد کا ہو یا قبول کا، شہادت ہمیں پوری ذمے داری سے طلب کرنی ہوتی ہے اور خود فن کار کے اندر سے۔

جون ایلیا کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ دل و دنیا کی آویزش تو اپنی جگہ اُن کے تو اپنے اندر بھی ایک کشاکش دل و دماغ کے مابین ہے۔ دل کے اپنے مطالبے ہیں اور دماغ کے اپنے تقاضے۔ دل اپنی تنہائی کو جینا چاہتا ہے، دماغ اسی تنہائی کو تماشا بنانا چاہتا ہے۔ دل اپنی ذات سے کائنات تک انسانی محرومیوں اور مجبوریوں کا رنج اٹھاتا ہے اور دماغ اسی رنج و محن سے کھلواڑ کرتا ہے۔ دل اپنے دکھ کو رونا چاہتا ہے اور دماغ اس پر آہ و زاری کی فصلیں بونا چاہتا ہے۔ غرضے کہ دل و دماغ کے مابین ایک مسلسل آویزش اور تصادم کی اس فضا نے آگے چل کر ایک حتمی اور فیصلہ کن رُخ اختیار کیا اور یہ رخ تھا دل کی شکست اور دماغ کی فتح کا۔ یعنی زخم وہ جس کی نمائش کی جاسکے، دکھ وہ جسے سینے پر آویزاں کیا جاسکے، آنسو وہ جس کی آواز سنی جاسکے — اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جون ایلیا کی آواز مکمل طور پر نفی کی آواز میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ اب یہاں رشتوں کی، جذبوں کی، خواہشوں کی، امنگوں کی، وجود کی، روح کی، حیات کی، کائنات کی، ورا کی، وراء الورا کی — سب کی نفی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب یہ ایک کھیل ہے جس سے جون ایلیا ہی

نہیں، اُن کے قارئین و سامعین کی اکثریت محظوظ ہو رہی ہے، اس لیے کہ اس کھیل میں تضادات، ڈرامائیت، تفنن، تحیّر، وارفتگی اور دستبرداری جیسے وہ سب عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں جو اس کھیل میں عامۃ الناس کی دل چسپی کو برقرار رکھتے ہیں۔

لیکن کیا یہ سب محض کھیل تماشا ہے؟ دیکھیے یوں ہے کہ جون ایلیا نے اپنی شاعری کی پیش کش میں نہایت محنت، مہارت اور متانت سے اُن سب عناصر کو استعمال کیا ہے جو اسے دل چسپ کھیل بنا سکتے تھے— لیکن جہاں تک سوال ہے شاعری کا، وہ اُن کے لیے ہرگز کھیل نہیں۔ یہ اُن کے لیے زندگی کی ایک مکمل سنجیدہ اور معنی خیز سرگرمی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بجائے خود ایک طرزِ زیست ہے اُن کے لیے۔ انھوں نے شاعری بسر کی ہے، اسے زندگی کی طرح جیا ہے۔ اس حقیقت کا سراغ ہمیں اُن کے ایسے اشعار اور ان نظموں سے ملتا ہے جن پر اُن کی خودساختہ اور اختیار کردہ ڈرامائیت کسی نہ کسی وجہ سے اثرانداز نہ ہو سکی۔ یہاں پر بالکل ہی ایک دوسرا جون ایلیا ہمارے سامنے آتا ہے۔ دیکھیے ذرا اس کا طرزِ سخن:

آپ اپنے سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں! سانس پھول جاتی ہے

———

کیا مل گیا ضمیرِ ہنر بیچ کر مجھے
اتنا کہ صرف کام چلاتا رہا ہوں میں

———

میں اور پاسِ وضعِ خرد— کیا ہوا مجھے
میری تو آن ہی مرے دیوانہ پن میں تھی

———

مجھ میں وہ شخص ہو چکا جس کا کوئی حساب تھا
سود ہے کیا زیاں ہے کیا، اس کا سوال بھی نہیں

وہ خوشبو مجھ سے بچھڑی تھی یہ کہہ کر
منانا سب کو پر اب روٹھنا نئیں
بچھڑ کے جان! تیرے آستاں سے
لگایا جی بہت پر جی لگا نئیں
وہ ہجر و وصل تھا سب خواب در خواب
وہ سارا ماجرا جو تھا وہ تھا نئیں

تو کبھی سوچنا بھی مت، تو نے گنوا دیا مجھے
مجھ کو مرے خیال کی موج بہا کے لے گئی

پڑے ہیں ایک گوشے میں گماں کے
بھلا ہم کیا، ہماری زندگی کیا

کیا ہے جو بدل گئی ہے دنیا
میں بھی تو بہت بدل گیا ہوں

یہ سب شعر کسی کاوش کے بغیر منتخب کیے گئے ہیں لیکن صاف طور سے دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں ایک دوسرا ہی رنگِ سخن اور ایک الگ ہی طرزِ احساس ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان اشعار میں کوئی ڈرامائیت، کوئی شکوہ، کوئی تضحیک، کسی شے کی نفی، کچھ

بھی تو نہیں۔ ایک سچے اور اصل انسان کے فکر و احساس سے آباد ہے یہ دنیا۔

سوال یہ ہے کہ اسے کیسے سچے انسان کی دنیا کہا جاسکتا؟ اور وہ جو دنیا ہم اس سے پہلے جون صاحب کے ہاں دیکھ کر آئے ہیں، ہم اسے سچی دنیا کیوں نہیں کہہ سکتے؟ ان دونوں کے درمیان سچائی کا فیصلہ آخر ہوگا کس بنیاد پر؟ بس یہی بات سمجھنے کی ہے۔ اب ہم اگر ایک لمحے کے لیے جون ایلیا کی ڈرامائیت سے دھیان ہٹا کر ان دونوں آوازوں پر توجہ دیں تو ہم محسوس کرسکتے ہیں کہ وہ پہلے نقل کیے گئے اشعار کا رنگِ سخن ہو یا پھر اِن اشعار کا— دونوں جگہ ایک ہی انسان کی آواز گونجتی ہے۔ ہاں، ایک ہی انسان کی۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ پہلے اور زیادہ گونج کے ساتھ ہم تک پہنچنے والی وہ نفی کی آواز دراصل حقیقت کو پانے اور بیان کرنے کے معکوس تجربے سے عبارت ہے۔ جون ایلیا جب سب کی نفی کرتے ہیں تو دراصل اس کا محرک نفی کا جذبہ نہیں ہوتا بلکہ اثبات کی شدید خواہش اس کی بنیاد بنتی ہے۔ حقیقت کو قطعی منقلب صورت میں پانے کی ناقابلِ برداشت خواہش۔ اب غور کیجیے کہ ان کے دل میں اس گھر کی دیکھ بھال کی کتنی شدید خواہش ہے جس کی روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے۔ یہاں افتخار خدا کا رد لکھنے پر نہیں ہے بلکہ رنج اس بات پر ہے کہ ہم تم پر بھی گراں گزر گئے۔ یہاں رونا اس کا ہے کہ خاندان میں اب ٹوکنے والوں کی وضع بدل گئی۔ غم یہ ہے کہ اس بھری دنیا میں ایک ہی شخص سے چین پڑ سکتا تھا اور وہی میسر نہیں۔ ذرا توجہ دیجیے تو اندازہ ہوگا کہ اپنی تباہی کا کیسا جان لیوا ملال ہے۔ یہاں خواہشیں تو ساری اصل ہیں، فطری اور خالص انسانی ہیں لیکن ان کا اظہار معکوس صورت میں ہو رہا ہے۔ یہی خواہش انھیں یہ سب کھلواڑ کرنے اور ناٹک رچانے پر اُکساتی ہے۔ شہزاد احمد نے آٹو ریتک پر اپنی کتاب میں ایک جگہ فرد کی تنہائی کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ تنہائی کا احساس انسان کے اندر دنیا کو اپنا بنانے اور اُسے پانے کی خواہش 'ترکِ دنیا' کے شدید احساس کی صورت میں بھی پیدا کرتا ہے۔ اصل میں یہاں

خواہش دنیا کے حصول کی نہیں ہے بلکہ فکر اس تنہائی کے جان لیوا احساس سے نجات کی ہے۔ اس مسئلے کو ہم ''روکو، مت جانے دو'' کے تناظر میں سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں سانس کا وقفہ اور آواز کا زیر و بم بات کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ جون ایلیا کے رد جذبہ وعقیدہ اور ترکِ رشتہ و پیوند کو بھی ذرا اس انداز سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم ایسا کریں گے تو اُن کی شاعری کے کچھ اور ہی معانی منکشف ہوں گے۔

جون ایلیا ہمارے ان شاعروں میں نہیں جو فکری سطح کے بڑے بڑے اور جاں کاہ سوالوں سے دوچار رہے ہیں۔ انھوں نے تو جذبے کی سطح پر قیام کیا۔ اس مقام کی اپنی حقیقتیں ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہاں پر التباس کی بھی اپنی کچھ صورتیں ہوتی ہیں اور جون ایلیا نے التباس کی ہر ممکنہ صورت سے اپنے شعر و سخن میں کام لیا ہے۔ ہم اس حقیقت کو سمجھ کر جب اُن کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک اور ہی رُخ سے وہ ہمارے سامنے آتے ہیں اور اُن کی شاعری اپنے جہانِ معنی کا ایک الگ ہی انداز میں ابلاغ کرتی ہے اور تب پورا جون ایلیا اپنے اصل مسئلے کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اُس وقت ہم پر اُن کی مشاعروں اور محفلوں میں مرکزِ توجہ بننے والی اداکاری، ٹھٹھول اور مجمع بازی کی حقیقت آشکار ہوتی ہے — لیکن جب ہم یہ جان لیتے ہیں تو پھر ہمیں ان میں کسی چیز سے کوئی الجھن نہیں ہوتی بلکہ ہم اس جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹا کر اُن کے شعری احساس کو اپنے عہد کے انسانی تجربے کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے اور اُن کی آواز کے حزن کو محسوس کرتے ہیں — اور اس آرزو کی شدت اور اس خواہش کی وحشت کو سمجھنے لگتے ہیں جس نے رشتوں اور جذبوں کی پوری کائنات کو اپنے عہد کے مروجہ اسالیب و علائم کے قطعی برعکس پیرایے میں زندہ رکھنے، بچانے اور پانے کی یہ صورت بنائی۔ جون ایلیا کا معاصر شاعری میں یہی حصہ ہے جو انھیں اوروں سے الگ کرتا ہے۔

○

شہر میں اپنی طرح کا آخری مہذب اور مجلسی آدمی، شاعر — جون ایلیا

میں سمندر کی وہ شام نہیں بھولتا۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج، دھوپ برساتا ہوا نڈھال بے حال سا پانی میں اترا ہی چاہتا تھا کہ اچانک — ایک پرندہ اپنی لہر میں جھومتا گاتا اس کے درمیان سے گزرتا ہوا، اگلے منظر کی بانہوں میں سمٹتا، میری حیران اور خیرہ آنکھوں کی بے منظری میں گم ہوگیا۔ میں نے دیکھا — سورج کے درمیان ایک لکیر سی کھنچ گئی ہے جیسے سورج کے چہرے پر دراڑ پڑ گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے یہ لکیر، مجھے اپنی آنکھوں میں جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سورج اب آدھا سمندر میں اتر چکا تھا، تقریباً وہاں تک — جہاں ایک سیاہ لکیر پرندے کی گزرگاہ کی نشاندہی کر رہی تھی۔ سورج اب آدھا سمندر میں اتر چکا تھا، باقی ماندہ سورج کو میں نے آنکھوں میں جلتی ہوئی لکیر سے باندھا اور ساحلی ریت پر دائرے بناتی ہوئی، ہوا سے باتیں کرتا ہوا، اس خوشبو کی جانب روانہ ہوگیا جس کا پتا ذرا دیر پہلے قریب آتی ہوئی ایک لہر نے مجھے بتایا تھا۔ ریت میرے پاؤں سے سرکتی رہی — لہریں مجھے خوشحال کرتی گزرتی رہیں، پرندوں اور بچوں کی سرگوشیاں ڈھلتی

ہوئی شام کے آئینے میں لو دینے لگیں اور پھر — میں نے اسی ڈھلتی ہوئی شام کے آئینے میں آدھے سورج کا عکس رکھ دیا۔ اب آدھا سورج پانی میں اور آدھا شام کے آئینے میں تھا۔ میری آنکھوں میں کھنچی ہوئی لکیر سے لپٹی ہوئی دھوپ، دھیرے دھیرے بکھرتی ہوئی شام کے صحن میں اترتی ہوئی رات کے ماتھے پر ستارے بن کر پھیلتی گئی۔

دور ایک ستارے نے کسی کے آنے کی خبر دی — بادبانی کشتی کنارے آ لگی۔ کشتی سے اترنے والے کچھ سائے تھے جو لہولہان تھے۔ یہ زمین پر کھنچی ہوئی چھوٹی بڑی مختلف شکلوں کی لکیروں کے قیدی تھے جو اپنی اپنی لکیروں میں آزادی کی حفاظت کے لیے مارے جا رہے تھے — ایک دھماکے پر میں چونکا، میں نے پلٹ کر شہر کی طرف دیکھا، شہر گولیوں کی آواز سے بے برکتا ہوا جا رہا تھا۔ میدان بچوں کی دھنک سے خالی ہو رہے تھے اور ان میدانوں میں اب چوکیاں بنتی جا رہی تھیں، حفاظت کے لیے — مگر کس کی حفاظت کے لیے؟ یہ بھید آج تک نہ کھلا — اور پھر یہ چوکیاں مجھے پوری دنیا میں پھیلتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، جہاں آمد و رفت کے لیے ہمیں اپنا ہونا رجسٹرڈ کرانا ہے — ہم جنھیں ہر صبح اٹھ کر ایک نئے سورج کے ساتھ ایک نئی امید کی ہمراہی میں طلوع ہونا پڑتا ہے، قریب ہی ایک آواز ابھرتی ہے:

کیوں شکستہ ہے ترا رنگ متاعِ صد رنگ

اور پھر اپنے ہی خونیں جگروں کے ہوتے شہر کا کام ہوا۔ فرطِ حفاظت سے تمام اور چھلنی ہوئے سینے پسروں کے ہوتے جبر و قدر کی حالتوں میں چلتے ہوئے کائناتی نظام میں زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں اور بدصورتیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو زندگی گزارتے ہیں، کچھ جنھیں زندگی گزارتی ہے مگر کچھ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو کبھی زندگی کو اور کبھی زندگی ان کو گزارتی ہے اور اس دہرے کھیل میں وہ اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ آخری لمحوں تک شامل رہتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے منصف و مرتبے کے لوگ ہیں،

زندگی کے دامن کو حسنِ خیال سے بھرتے ہوئے لوگ، محبت کرنے والے امن و آشتی کے متوالے لوگ، ظلم کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز میں آواز ملاتے ہوئے لوگ۔ خود آواز بن کر ظلم سے نبرد آزما رہنے والے لوگ۔ کہانیاں لکھتے ہوئے، تصویریں بناتے ہوئے گیت گاتے ہوئے، شاعری کرتے ہوئے لوگ۔ اپنی ذات میں کائنات اور کائنات میں ماورائے ذات کا نظارہ کرتے ہوئے لوگ۔ بدلتے ہوئے زمانوں کی شکست و ریخت کو لمحہ بہ لمحہ پڑھتے ہوئے، جھیلتے ہوئے، لکھتے ہوئے اور بولتے ہوئے لوگ۔ یہ لفظ تراشنے اور لفظ کی حرمت پر جان دینے کے ہنر سے آگاہ لوگ:

ہاں لفظ ایجاد ہیں
یہ ہزاروں — ہزاروں برس کے سراسیمہ گیہہ اجتہادِ تکلم کا انعام ہیں
ان کے انساب ہیں
جن کی اسناد ہیں
اور پھر ان کی تاریخ ہے
اور معنی کی تاریخ کوئی نہیں

میری نگاہ شہر کے کسی گوشے سے اٹھنے والے اس دھویں کی جانب اٹھتی ہے جو فضا میں پھیلتا جا رہا تھا اور جس سے ادھر خوش رنگ منظروں کی قطار چھپتی چلی جا رہی تھی — کتنے برس بیت گئے، آگ، دھواں، لہو، دہشت گردی اس شہر کا مقدر ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ تاب ناک دنوں اور روشن راتوں والا شہر۔ یہ نت نئی مشینوں، کارخانوں، مزدوروں، ہنر مندوں، محنت کشوں کا آباد اور صنعتی شہر۔ یہ مچھیروں، ملاحوں کے گیتوں کی آوازوں میں جاگتا ہوا شہر، خوب صورت تذکروں، لازوال قصوں کہانیوں والا شہر، اپنے اندر بولتے ہوئے موسموں کی تہ داریاں رکھنے والا شہر۔ یہ اداس اور خوش حال لوگوں کا شہر — یہ شاعروں، ادیبوں، دانش وروں، موسیقاروں کا شہر، زندہ اور بے مثال لوگوں کا شہر کتنے ہی

نام حافظے کے اُفق پر ستاروں کی طرح چمکنے لگے۔ یہ سلیم الزماں صدیقی، محمد حسن عسکری، عزیز احمد، سلیم احمد، ممتاز حسین، قمر جمیل، عزیز حامد مدنی، بہزاد لکھنوی، زیڈ اے بخاری، قمر جلالوی، ابو اللیث صدیقی، محمد خالد اختر، کرار حسین، مجتبیٰ حسین، رئیس امروہوی، آل رضا، ماہر القادری، نازش حیدری، بہار کوٹی، صبا اکبر آبادی، شاعر لکھنوی، اطہر نفیس، فرید جاوید، رئیس فروغ، رضی اختر شوق، ابوالفضل صدیقی، سیّد محمد تقی، عبدالرؤف عروج، عالم تاب تشنہ، محشر بدایونی، عارف عثمانی، حمید نسیم، صہبا اختر، صہبا لکھنوی، سرور بارہ بنکوی، جوہر سعیدی، حکیم انجم فوقی، تحسین سروری، افسر آذر، ایوب کونڈوی اور بہت سے لکھنے اور پڑھنے والے جواب ہم میں نہیں ہیں اور جن میں ہر ایک اپنی جگہ ایک خاص طرزِ فکر رکھتا تھا، ان سب کا اور بہت سوں کا شہر۔

یہ خوب صورت خیال و خواب رکھنے والے لوگ اسی شہر میں، اور اسی شہر کی گلیوں میں، اس کے قہوہ خانوں میں، اپنی بیٹھکوں میں، ہوٹلوں میں، اپنی خلوتوں میں اور اپنی محفلوں میں اپنی گفتگو کا اپنی شاعری کا اپنے مکالموں کا جادو جگاتے اور اپنے خوابوں کو دکھاتے اور سناتے، نیندوں اور رت جگوں کی سرشاری میں صبح کو شام سے اور شام کو صبح سے ملاتے ہوئے چلے گئے۔ شام کے زینے سے رات دبے پاؤں اتر رہی تھی — میں قریب ہی بیٹھ جاتا ہوں اور ان سب لوگوں کے ہجوم کو گردش کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ سرد رات کی ہوا سے یادوں کا الاؤ تیز ہونے لگتا ہے۔ میں اس الاؤ کے قریب عبیداللہ علیم اور جون ایلیا کو دیکھتا ہوں — جو ایک دوسرے سے کسی ایسی بات میں الجھے ہوئے ہیں جو تھی نہیں — مگر تھی! میں نے ان دونوں کو ہمیشہ ایک ساتھ ہی دیکھا تھا۔ دونوں اپنے مزاج اور رویوں میں مختلف مگر دونوں اپنی جگہ سچے اور کھرے شاعر — اتنے بہت سے لوگوں کا اس طرح چلے جانا، ہر عمر کی صفوں کا یوں خالی ہوتے جانا، خوابوں کی پامالی کا تماشا ہے جو ہم مسلسل دیکھتے چلے آ رہے ہیں اور بے بس ہیں۔ یہ ایک دوسری طرح کا بحران ہے جو

پہلی طرح کی ویرانی سے زیادہ ہول ناک ہے۔ ہوا تیز ہو جاتی ہے، الاؤ بڑھتا جا رہا ہے، اس الاؤ سے ایک چنگاری قریب کی کچھ یادوں کو واضح کرتی ہوئی پھیلتی جاتی ہے۔ پروین شاکر امیدوں اور خوشبوؤں بھری شاعرہ — زندگی کی فتوحات میں بہت تیز رفتار تھی۔ پھر ایک دن اس تیز رفتاری میں اس کی گاڑی سامنے آنے والے ایک خوف ناک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ اب پتا نہیں یہ ٹرک کا رستہ تھا بھی کہ نہیں۔ یہ خوشبو کا قتل تھا — صغیر ملال جیسا ذہین شاعر اور کہانی کار اور ترجمہ کرنے والا — ڈاکٹر کے نہ ملنے پر ایک غلط انجکشن لگنے سے موت کے منہ میں چلا گیا۔ بچ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ ذہانت کا قتل تھا۔ ثروت حسین جیسا خوب صورت شاعر بار بار ٹرین کے سامنے آتا یا ٹرین اس کے سامنے آتی، بچ نکلنے کا کوئی رستہ ہی نہیں تھا۔ یہ خوب صورتی کا قتل تھا — جمال احسانی جیسا بانکا اور تیکھا شاعر، ڈاکٹروں کے مشوروں کی اکھاڑ پچھاڑ میں اپنی بیماری سے لڑتا لڑتا ہار گیا۔ یہ ایک شاعر کا قتل تھا — کتنا دکھ دینے والا ہے یہ سب کچھ — عبید اللہ علیم، ادب میں جعلی آدمی کے خلاف آواز اٹھاتے اٹھاتے شاعر اور شاعری کا مقدمہ لڑتے لڑتے سچ مچ شاعر ہونے کا اعزاز اپنے سینے پر سجائے ہوئے درمیان سے اپنی مسرتوں اور دکھوں سمیت گزر گیا۔

جون ایلیا، جو ہمیں ان دیکھنے زمانوں کی سیر کراتا، شہر کے بجھے ہوئے اور روشن لوگوں میں خوب صورت خواب و خیال کی دھنک تقسیم کرتا اور بعض اوقات وہ اپنی شاعری میں جسم اور روح کی پر اسراریت کو اس طرح کھولتا اور اس طرح کھینچ لاتا کہ سننے اور پڑھنے والے ایک عجیب ہی کیفیت میں چلے جاتے۔ جون ایلیا اپنے لہجے کی انفرادیت میں اتنا سفاک تھا کہ آپ اپنی تنہائی میں یا محفل میں اس کی شاعری اپنی طرح پڑھ ہی نہیں سکتے — وہ جون ایلیا — جو شہر کو روحانی آکسیجن فراہم کرتا رہا — ایک دن، ہاں ایک دن اسی شہر میں، کسی مکان کے اندر — ایک کمرے میں تنہا، بروقت آکسیجن نہ ملنے پر اپنے اندر گھٹ کر خاموش ہو گیا اور پھر یوں ہوا — کمرے کی تنہائی نوحہ کرتی ہوئی سڑکوں پر نکل آئی اور

محفل محفل بین کرنے لگی۔

یہ عہد وہ ہے کہ دانش ورانِ شہر پہ بھی منافقت کی شبیہوں کا خوف طاری ہے۔

نمازِ خوف کے دن ہیں کہ ان دنوں یاروقلندروں پہ فقیہوں کا خوف طاری ہے۔

یہ ہیں وہ تیرہ دلانِ قلمرو تاریخ
جو روشنائی دانش کا خون کرتے رہے
یہی تو ہیں جو حکیموں کی حکمتوں کے خلاف
ہر ایک دور میں حاکم کے کان بھرتے رہے

گزشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں
جو رد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

یہ آواز ہمارے عہد کے منافقانہ رویوں کے خلاف احتجاجی مہم کی تاریخ ہے—

اور تاریخ کے اس آئینے میں ہم اپنی آرزوؤں، اپنی تمناؤں اور اپنے امکانات کی لہولہان شبیہیں دیکھ سکتے ہیں۔

جون ایلیا— اپنے اندر دھمال ڈالتا ہوا اور اپنے باہر رقص کرتا ہوا، ہر لمحہ اضطرابی اور بے خوابی میں مبتلا ایک بے مثال سخنور تھا— وہ نوٹنکی، رام لیلا اور ڈرامے کا دیوانہ تھا۔ وہ اپنی خیالی محبوبہ صوفیہ کو خط لکھتا— یہ خیال آفرینی کا ایک بہانہ تھا، وہ تو ایک ایسی بات ان خطوں میں، اسے لکھنا چاہتا تھا، جو ایک حقیقت بننے والی تھی اور وہ یہ کہ— ''ہمیں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے'' اس جملے میں '' کچھ کرنا چاہیے'' کا جو دکھ ہے وہ اتنے زمانے گزرنے کے بعد آج بھی اسی طرح محسوس ہوتا ہے۔

جون ایلیا — جو کسی بھی قاعدے اور ضابطے کو تسلیم نہیں کرتا، مگر اپنی شاعری میں، اپنی تمام تر بے ضابطگیوں کے باوجود قاعدوں اور ضابطوں کی نہ صرف پاسداری کرتا بلکہ انھیں نبھاتا بھی ہے اور شاعری، تو اس کے لیے زندگی کرنے کا ایک ڈھب تھا — وہ ایک قادر الکلام سخن ور تھا، جو زبان و بیان کی باریکیوں سے اور اس کی وسعتوں سے آگاہ تھا۔ بہت سے لوگ جون ایلیا کو بے راہ رو — اور خود فراموشی میں مبتلا آدمی قرار دیتے رہے ہیں — نہیں وہ ایسا نہیں تھا — وہ بے حد محتاط، انتہا درجے کا ہوشیار اور معاملہ فہم آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رد کیا کرتا ہے اور قبول کیا کرتے رہنا ہے — وہ تو بس کبھی کبھار، اس کی ترتیب بدل دیتا تھا۔ یعنی جسے رد کرنا ہے اسے قبول کر لیتا اور جسے قبول کرنا ہوا سے رد کر دیتا — یہ اس کا کھیل تھا اور اس کھیل پر اسے اختیار نہیں تھا، وہ عجیب ہوش مند تھا۔ وہ کہتا تھا کہ لکھنا لکھانا دراصل غیر فطری فعل ہے۔ تمام باشعور ادیبوں کو لکھنے لکھانے سے کنارہ کر کے صرف بولتے رہنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ہوتا ہے یوں بھی، تخلیقی آدمی ایسی صورتِ حال سے بھی دوچار ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بالکل خاموش ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ان زمانوں کی رو سے بھی گزرتا ہے جو اسے زندگی کے ایک نئے تجربے سے آشنا کرتی ہے — مگر جون ایلیا نے اپنی بات میں "باشعور ادیبوں" کی کڑی شرط لگا کر اپنی بات میں جو وزن پیدا کیا ہے، وہ اس کے باہوش ہونے کی دلیل ہے۔ ادیب اگر باشعور ہوگا تو لکھنے لکھانے کا غیر فطری کام اور بولتے رہنے کی فطری جہت، دونوں میں اپنا ہونا ثابت کرتا رہے گا لیکن کبھی کبھار لکھنے لکھانے کے موسموں میں بولتے رہنا چاہیے اور بولتے رہنے کے دنوں میں لکھتے لکھاتے رہنا چاہیے اور جون ایلیا ایسا ہی کرتا تھا۔ وہ اپنی ہی بات کو رد کر کے اسے قبولیت کے درجے تک پہنچا دیتا تھا، وہ اپنے شک سے اپنا یقین کشید کرتا تھا:

بہت بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا کیں

چپ رہنے کے سناٹے سے جو مژدہ ابھرتا ہے وہ خدا کے ہونے کی آواز ہے۔

اتنا خالی تھا اندروں میرا
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں

خدا تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ کمرے میں بہت ساز و سامان بھر جائے تو تنہائی اشیا کی تہوں میں سمٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ضرورتوں کی دیمک جب ان اشیا کو کھانے لگتی ہے تو کمرے کے خالی پن میں تنہائی پھیلتی چلی جاتی ہے اور پھیلتی ہوئی تنہائی میں جو تجربہ ظہور کرتا ہے، وہ خدا کی موجودگی کا ہے — اس تجربے کو جس شدتِ احساس کے ساتھ جو ایلیا نے تحریر کیا ہے۔ وہ اس کے اندر کچھ دنوں نہیں — بلکہ بین السطور ہمیشہ خدا رہنے کا احساس اور یقین ہے۔

جون ایلیا کے بہت سے اشعار آپ کو بظاہر اس کی قادر الکلامی کا معجزہ دکھائی دیں گے مگر قادر الکلامی کا یہ معجزہ یوں ہی تو رونما نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ذات کے غارِ حرا میں شاعر کو خلوت اختیار کرتے ہوئے کبھی خود سے کبھی خدا سے اور کبھی کائنات سے مکالمہ کرنے کی ریاضتوں سے گزرنا پڑتا ہے اور جون ایلیا اُن محدود شعرا میں سے ہیں جن کی قادر الکلامی مصرع گڑھنے کی مشق نہیں، زندگی کرنے کا ہنر ٹھہرتی ہے۔

ترے عدم کو گوارا نہ تھا وجود مرا
سو اپنی بیخ کنی میں کمی نہ کی میں نے
خراشِ نغمہ سے سینہ چھلا ہوا ہے مرا
فغاں کہ ترک نہ کی نغمہ پروری میں نے

تو مرے بدن سے جھلک بھی لے، میں ترے بدن سے مہک بھی لوں
ہمہ نارسائی ہے جانِ جاں گئی پل کا تو گئی پل کا میں

تو مرا حوصلہ تو دیکھ داد تو دے کہ اب مجھے
شوقِ کمال بھی نہیں خوفِ زوال بھی نہیں

نصیب ہو کوئی دم وہ معاشِ حال کہ ہم
حسابِ سلسلۂ صبح و شام کے نہ رہیں

اے شخص اب تو مجھ کو بھی کچھ قبول ہے
یہ بھی قبول ہے کہ تجھے چھین لے کوئی

یہ غنیمت ہے کہ اسرارِ ہستی سے ہم
بے خبر آتے ہیں بے خبر جائیں گے

سایۂ ذات سے بھی رم عکسِ صفات سے بھی رم
دشتِ غزل میں آ کے دیکھ، ہم تو غزال ہو گئے
کتنے ہی نشہ ہائے ذوق، کتنے ہی جذبہ ہائے شوق
رسمِ تپاکِ یار سے رو بہ زوال ہو گئے
کیسے زمیں پرست تھے عہدِ وفا کے پاسدار
اڑ ے بلندیوں سے ہم گردِ ملال ہو گئے
شور اٹھا مگر تجھے لذتِ گوش تو ملی
خون بہا مگر ترے ہاتھ تو لال ہو گئے

کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے
آپ اپنے سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

میں نے پچھلے دنوں جون ایلیا کے بارے میں ایک معروف شاعر کی رائے پڑھی جو کچھ یوں ہے۔

> جون ایلیا شاعری میں نہ تو کسی اسلوبِ خاص کا موجد ہے اور نہ ہی کسی نئے لہجے کا خالق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی انفرادیت وہ تکمل پن ہے جو بہت کم لوگوں کو ارزانی ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں کسی محنت کا یا تردد کا بھی سراغ نہیں ملتا بلکہ لگتا ہے کہ یہ غزلیں اس نے بس ایسے ہی لکھ دی ہیں لیکن جو الفاظ وہ زیرِ استعمال لاتا ہے، ان پر اس کی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ شاعروں کے اس ہجوم میں ایک شاعر کی آمد آمد صاف دکھائی اور سنائی دیتی ہے۔ پھر اس نے بعض لفظوں کے پرانے تشخص کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے اور اس طرح ایک نئے اور عجیب ہی ذائقے کا اضافہ کر کے دکھا دیا ہے۔

یہ جو آخری سطر میں، ایک نئے اور عجیب ذائقے کا اضافہ کر کے دکھا دینے والی بات ہے یہی تو وہ اسلوبِ خاص ہے جسے جون ایلیا نے اپنی ریاضتِ فن سے تراشا ہے اور شاعری میں یہی تو اس کا وہ لہجہ ہے جس کا وہ خالق ہے اور جس کا اس نے دعویٰ نہیں کیا۔

ظاہر ہے جون ایلیا شاعری کا تجربہ کرنے تو نہیں آیا تھا، شاعری تو عشق کی طرح اس کے لہو میں رچی بسی تھی، وہ تو تجربوں کی کیفیتوں کو، جذبوں کو، گفتنی ناگفتنی کو، معلوم نامعلوم کو شاعری بنانے پر مامور تھا۔ کچھ سوال تھے جنھوں نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا تھا اور ان سوالوں کو وہ ہمارے درمیان اٹھا لایا تھا:

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

کہیں کہیں وہ خود ہی ان سوالوں کا جواب دیتا ہوا نظر آتا اور کہیں وہ اپنے سوال ہی کو جواب کا اصل سمجھتا ہے۔

اپنے حجرے کا کیا بیاں کہ یہاں
خون تھوکا گیا شرارت میں
وہ خلا ہے کہ سوچتا ہوں میں
تجھ سے کیا گفتگو ہو خلوت میں
زندگی کس طرح بسر ہو گی
جی نہیں لگ رہا محبت میں

اس کی آنکھوں میں یافت اور نایافت
زمانوں کے دکھ سمٹ آتے ہیں اور اس رائیگانی میں
سو وہ آنسو ہمارے آخری آنسو تھے
جو ہم نے گلے مل کر بہائے تھے

نہ جانے وقت ان آنکھوں سے پھر کس طور پیش آیا
مگر میری — فریبِ وقت کی بہکی ہوئی آنکھوں نے
اس کے بعد بھی آنسو بہائے ہیں
میرے دل نے بہت سے دکھ پائے ہیں
مگر یوں
کہ ماہ و سال اس کی رائگانی میں مری آنکھیں
گلے ملتے ہوئے رشتوں کی فرقت کے وہ آنسو
آنسو — ایسے کچھ آنسو
جنھیں آنکھیں ہی کیا روئی تھیں —
خود آنسو بھی روئے تھے

اس کا کہنا تھا کہ سچا شاعر ہونے کے لیے صرف ایک گواہی کی ضرورت ہے — دیکھا آپ نے، اس نے چھوٹے بڑے شاعر ہونے کا قضیہ نہیں اٹھایا۔ سچے شاعر ہونے کی بات کی ہے، اس سے ذرا ہٹ کر اصل مسئلہ تو شاعر ہونے ہی کا ہے باقی سب بعد کے لاحقے ہیں۔ ہاں تو صرف ایک گواہی کی ضرورت ہے اور یہ گواہی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اپنی ذات کو بیرونِ ذات سے دیکھا جائے، پرکھا جائے اور محسوس کیا جائے۔ یہ ہے وہ بات خواتین و حضرات! کہ خود شاعر کا وجود اسی کے ذہن سے باہر پایا جاتا ہے — اور یہ نظارہ بینی، اہلِ نظارہ پر ایک ایسے ہی جہانِ نادیدہ کا در کھولتی ہے جس کے تمنائی اور آرزومند ہوتے ہیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس منظرنامے کی شہادت کے لیے بھی شاعر کو اپنی ذات ہی کی راہ داریوں سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ جو کہا گیا ہی کہ اخلاق سے بے نیاز ہو کر بھی فن یا آرٹ اخلاق سے زیادہ بااخلاق ہوتا ہے تو جون ایلیا کی شاعری اس کا ایک واضح اظہار ہے۔

تو مرا حوصلہ تو دیکھ داد تو دے کہ اب مجھے
شوقِ کمال بھی نہیں خوفِ زوال بھی نہیں

ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم
تمھاری ہی تمنا کیوں کریں ہم
کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے
تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم
جو اک نسلِ فرد مایہ کو پہنچے
وہ سرمایہ مہیا کیوں کریں ہم
برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم
پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم
یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

آپ نے محسوس کیا شاعر ذات وحیات و کائنات کی تماشا گاہ میں اذیت کی کس منزل سے گزر رہا ہے۔ زندگی تو کبھی بھی سہل نہیں رہی — اور حساس لوگوں پر تو یہ دشوار سے دشوار تر ہوتی رہی ہے، جون ایلیا حد درجہ حساس شاعر تھا۔ اس کے وہ سارے غصے، ساری ناراضگیاں، ساری جھنجھلاہٹیں، محرومیاں، محبتیں اور سارے احتجاج جو اس کی شاعری میں جگہ نہیں پا سکے، اس کی نثری تحریروں میں ایک عالمانہ سنجیدگی اور شاعرانہ وارفتگی کے ساتھ در آئے ہیں۔

سمندر کی لہروں سے گزرتی ہوئی ایک لہر بپھرے ہوئے پانی سے اٹھ کر مجھے بھگوتی ہوئی ریت میں جذب ہوتی چلی گئی۔ بادبانی کشتی سے اترنے والے سایوں کے زخموں کو اب سرد ہوا کی تیزی بڑھتی جارہی تھی۔ سمندر سے اٹھنے والی موجوں نے ان کے چہروں کو اجلا کر دیا تھا۔ میں دور سمندر کے افق کو دیکھتا ہوں، رات کے کسی کونے سے سورج پانی سے باہر آنے کو ہے، آبی پرندوں کو اڑانوں نے بادلوں کے ٹکڑوں کو دور تک بچھا دیا۔ میں نے دیکھا کہ بادبانی کشتی میں سوار سایوں کے درمیان جون ایلیا بھی ہے۔ اس کی آواز ابھرتی ہے:

اتار دے جو کنارے پہ ہم کو کشتیِ خواب
تو گرد و پیش کے گرداب ہی سمجھتے ہیں
تمھارے رنگ مہکتے ہیں خواب میں جب بھی
تو خواب میں بھی اُسے خواب ہی سمجھتے ہیں

کشتی ایک معلوم سفر کی نامعلومیت کی جانب روانہ ہوگئی۔

جون ایلیا ہمارے شہر میں اپنی طرح کا آخری مہذب اور مجلسی آدمی تھا۔ اب یہ شہر اور طرح کے مہذب اور مجلسی آدمیوں کا شہر لگتا ہے — خواتین و حضرات یہاں اور طرح کے مہذب اور مجلسی کے لفظ پر آپ ناراض مت ہو جایئے گا۔ بات یہ ہے کہ جون ایلیا اور اس جیسے مہذب مجلسیوں کے ساتھ یہ "اور طرح" کا لفظ اپنے اندر اور طرح کے معنی و مفہوم اور توجیہہ کی کج دھج رکھتا ہے — ہم میں بہت سے زندگی کی ہوس میں زندگی سے ہار گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کھیل میں اب کی دفعہ زندگی نے جون ایلیا کو ہار دیا ہے۔

○

خرم علی شفیق

ترجمہ: دوست محمد خان

جون ایلیا ـــ ایک خاکہ

عہدِ جدید کی پیچیدگیوں کے اظہار کے وسیلے کے طور پر غزل نظم کے مقابلے میں زیادہ موزوں ہے اور میر تقی میرؔ اپنی قدامت کی بدولت نئی نسل کو زیادہ پسند ہو سکتے ہیں، بہ نسبت غالبؔ کے جو میرؔ کے مقابلے میں کم و بیش ساٹھ سال بعد پیدا ہوئے۔

ہم چاہے جون ایلیا سے متفق ہوں یا نہ ہوں، لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جون ایلیا کو سننا دلچسپی سے خالی نہیں اور بعض اوقات یہ باعثِ استعجاب بھی ہو سکتا ہے (جون ایلیا کی شاعری قاری کو محظوظ ہی نہیں کرتی، وقتاً فوقتاً اسے جھنجھوڑ بھی دیتی ہے) اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسے کلچر کی باقیات الصالحات میں ہیں جو اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ (سانسیں گن رہا ہے)، یعنی وہ اردو دان طبقہ جو عربی اور فارسی میں اپنی جڑوں کے قریب ہے۔ جون ایلیا کو اس اعتبار سے ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے کہ وہ نہ صرف اس سوسائٹی کا باغی ہے جس نے اس کلچر کے کچھ عزیز ترین عقائد کو ترک کر دیا ہے بلکہ دوسری جانب وہ اس سوسائٹی کی ذہنی وراثت کا امین اور اس کا وفادار نمائندہ بھی ہے جو اس کے قومی مزاج کی تجسیم بھی ہے۔ چار سال پیشتر شائع ہوئے اپنے

مجموعۂ کلام سے زیادہ اپنی منتشر شاعری کے لیے جانے والے جون ایلیا نے اپنی شاعری، خود پر مرتب ہونے والے اثرات اور کلاسیکی عربی ادب سے اپنے تشنۂ کام عشق کے بارے میں کچھ اس طرح اظہار خیال کیا تھا:

جوں جوں میرا شعور بالغ ہوتا گیا، میں اردو شاعروں کے مقابلے میں فارسی شعرا کو زیادہ پسند کرنے لگا۔ بابائے فارسی شاعری رودکیؔ، فردوسیؔ، عرفیؔ، نظیریؔ، حافظؔ، مولانا رومیؔ... یہ تمام اساتذہ سمجھے جاتے تھے۔ میں نے ایک تلمیذ کی طرح ان کا مطالعہ کیا — کسی اردو شاعر کو میں نے اس طرح نہیں پڑھا۔ اس گروپ کو میں ”دوستوں کے گروپ“ کی شکل میں دیکھتا تھا — کسی حد تک اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے علم تھا کہ انھوں نے بھی انھی اساتذہ کا مطالعہ کیا ہے جن کو میں نے پڑھا ہے۔ اس اعتبار سے میں ان سبھی کو اپنے ایسے ہم سبق سمجھتا تھا جنھوں نے ایک ہی دانشگاہ میں زانوئے تلمذ تہہ کیا ہو۔ بے شک ان میں سے چند میرے سینئر ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر، اگر مجھے نویں درجے کا طالب علم سمجھ لیا جائے تو میرے مقابلے میں میرؔ اور غالبؔ فائنل ایر کے طلبہ تھے، تاہم تھے تو ہم ایک ہی 'کالج کے ساتھی' — لیکن فارسی کے عظیم اساتذہ کا معاملہ قطعی مختلف تھا۔ وہ تو مرشد تھے، استاد تھے۔ اور اردو کے تمام بڑے بڑے شعرا نے ان عظیم فارسی اساتذہ سے کسبِ فیض کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ مثال کے طور پر غالبؔ نے اپنے ایک خط میں فردوسیؔ کے ایک صاحبِ کمال شاعر ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی خط میں انھوں نے ابنِ سینا کو عظیم ترین فلسفی قرار دیا ہے۔ دراصل ہمارے دور تک مسلم

معاشرے کا یہی عمومی مزاج رہا ہے۔ فارسی شعرا شاعرانہ کمال کی بہترین مثال تھے اور عربی فلسفی (عرب فلسفی نہیں بلکہ عربی فلسفی، کیوں کہ ان میں سے بیشتر غیر عرب تھے جو عربی زبان میں لکھا کرتے تھے) فکر و فلسفہ میں اساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ مغربی نظامِ فکر میں افلاطون اور ارسطو جس منصب پر فائز ہیں، ہماری روایت میں وہی مقام ابنِ سینا اور فارابی کو حاصل ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر تمام اردو شعرا نے اپنے فارسی استادوں کے تئیں انھی جذباتِ ممنونیت اور تشکر کا اظہار کیا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران ہی ان اثرات میں کمی آنی شروع ہوئی ہے جس کا سبب بظاہر فارسی زبان کا زوال ہے۔

تاہم بعد ازاں اردو شعرا کے تعلق سے میرے نقطۂ نظر میں قدرے تبدیلی واقع ہوئی۔ مجھے غالبؔ کی شاعری پسند آنے لگی اور میں ان سے خاصا متاثر اور ان کی شاعری سے بہت محظوظ بھی ہوا۔ میرے خیال میں اگر آپ کے سماجی مسائل سیدھے سادے ہیں اور آپ کے بیگانگی کے احساسات شدید ذاتی تجربے کے مقابلے میں نظریاتی نوعیت کے زیادہ ہیں تو آپ غالبؔ سے زیادہ متاثر ہوں گے۔ تاہم جب آپ کا شعور بالغ ہوتا ہے اور آپ ایک 'باہر والا' ہونے کے کرب سے گزرتے ہیں تو اغلب امکان ہے کہ آپ میرؔ کو زیادہ پسند کریں گے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہمارا مسئلہ بہت سیدھا سادہ تھا اور اس کا حل بالکل واضح تھا: انگریزوں سے آزادی حاصل کرو۔ تاہم آزادی کے بعد ہمارے مسائل زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے۔

جیسے جیسے میں صنعتی اکیلے پن کی دلدل میں دھنستا گیا اور تنہائی کے انتہائی کرب آمیز تجربات سے دوچار ہوا تو مجھے بھی غالبؔ کے مقابلے میں میرؔ زیادہ پسند آنے لگے۔

درحقیقت غالبؔ نے اپنے معاشرے کی شکست کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور اسے اس معاشرے کے زوال کے منطقی نتیجے کے طور پر قبول بھی کرلیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے باغیوں، جن میں ان کے بہترین دوست مولانا فضل حق خیرآبادی بھی شامل تھے، کے تئیں ان کے رویے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے۔ سید احمد خاں کے مرتب کردہ ''آئینِ اکبری'' کے نئے ایڈیشن پر ان کے طنزیہ تبصرے میں بھی ان کے اسی رویے کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان دونوں کے تعلق سے انھوں نے کہا تھا کہ عہدِ مغلیہ کا خاتمہ ہونا اور برطانوی راج کا آنا طے ہے کیوں کہ وہ ایک بہتر نظام ہے۔ میرؔ کا معاملہ دوسرا تھا کیوں کہ وہ غالبؔ سے دو نسل پیشتر پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت تک سلطنتِ مغلیہ کا انجام واضح نہیں ہوا تھا اور اسی لیے ان کی امیدیں اسی نظام سے وابستہ تھیں جس میں وہ رہ رہے تھے۔ ان کے کرب کی وجہ وہ دلی تشویش تھی جو ناخوش گوار واقعات کو اپنے سامنے پیش آتے ہوئے دیکھ کر ہوتی تھی۔ اس کے باوجود ان کے دل میں حالات کے بہتر ہونے کی امید قائم تھیں۔ ہم مابعد برطانوی دور کے دانش ور اس کیفیت سے بیگانے نہیں ہیں۔ ہمارا غم غالبؔ کے غم سے زیادہ پیچیدہ اور گہرا ہے، یہ میرؔ کے غم کی طرح ہے۔ اور میرؔ ہی کی طرح ہم نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے ــــ ہم نہیں

چاہیں گے کہ انگریز یا امریکی دوبارہ ہمارے ملک پر قابض ہوں۔

اس کے علاوہ بھی میرؔ کو پسند کرنے کی ایک اور وجہ ہے۔ میرؔ ہی واحد اردو شاعر ہیں جنھیں 'یکتائے روزگار' کہا جاسکتا ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ فی الواقع اردو کے دیگر تمام شعرا میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ہمسر ـــ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان سے افضل ـــ شاعر فارسی اساتذہ میں مل جائے گا۔ مثال کے طور پر غالبؔ اپنے فن پاروں کے لیے اپنے باضابطہ تفکر، بذلہ سنجی اور زندگی کے تئیں کلی نقطۂ نظر کے مرہونِ منت ہیں۔ لیکن یہ صفات ان کے پیشرو فارسی شاعر نظیریؔ میں بھی موجود ہیں اور اس طرح ایک اعتبار سے ہم نظیریؔ کو غالبؔ کا 'اوریجنل' سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ کر بآسانی غالبؔ سے صرفِ نظر کرسکتے ہیں کہ "جب میرے پاس نظیریؔ ہے تو میں غالبؔ کو کیوں پڑھوں؟" اسی طرح اقبالؔ کا بہتر متبادل ان کے 'اتالیق' رومیؔ ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح جوشؔ جو اپنے آہنگ، نغمگی اور ایک قسم کی شان وشوکت کے لیے جانے جاتے ہیں، اپنی تازہ کاری سے کسی حد تک محروم ہوجاتے ہیں جب ہم انھی خصوصیات کو زیادہ باکمال انداز میں قاآنیؔ کی شاعری میں جلوہ گر پاتے ہیں۔

اس کے برعکس میرؔ کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ وہ خالصتاً ہندوستانی شاعر ہیں جنھوں نے فارسی کی گوناگوں خصوصیات کو انگیز کر کے ان کو خصوصی طور پر اردو سے ہم آہنگ کیا ہے۔ میرؔ کے کلام میں وہ 'ہندوستانیت' ہے جو غالبؔ کے یہاں مفقود ہے۔ مثال کے طور پر

درج ذیل اشعار دیکھیے:

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

اس شعر میں جس لہجے کی جھلک ملتی ہے وہ فارسی سے قطعاً مستعار نہیں ہے— اور یہ ان کی شاعری کے اساسی اردو عنصر کی ایک مثال ہے!

اور اس کے باوجود میرے لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ ان عظیم شعرا میں سے کس نے میری شاعری کے لب و لہجے اور لفظیات کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ میری شاعری میں تین یا چار لہجوں کا عکس ملتا ہے جن کی مثال کے طور پر درج ذیل اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

چبالیں کیوں نہ خود اپنا ہی ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

خوش گزرانِ شہرِ غم، خوش گزراں گزر گئے
زمزمہ خواں گزر گئے، رقص کناں گزر گئے

شاید میری شاعری کا تجزیہ کرنے والا نقاد ہی بہتر طور پر یہ بتا سکے گا کہ ان میں سے کس شاعر نے میرے طرزِ کلام کو زیادہ متاثر کیا ہے:

کس سے اظہار مدعا کیجے
آپ ملتے نہیں ہیں، کیا کیجے

جس طرح جون ایلیا نے موجودہ دور کی عکاسی کے لیے میر کا انتخاب کیا ہے، اسی طرح ان کا کہنا ہے کہ عصرِ حاضر کے مسائل کے اظہار کے لیے صنفِ غزل بہترین ذریعہ اظہار ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی کے دوران میں سماجی اور سیاسی موضوعات پر شاعری کرتا رہا۔ ان میں سے بیشتر مارشل لا کے خلاف تھی جسے فیلڈ مارشل ایوب خاں نے لگایا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۲ء میں، میں نے ایک طویل رزمیہ نظم لکھنا شروع کی اور فی الوقت اس کا عنوان 'نئی آگ کا عہد نامہ' رکھا۔ اب میں نے اس کا عنوان بدل کر 'رزمیوں' کر دیا ہے لیکن یہ نظم ہنوز نامکمل ہے۔

مجھے غزل یا نظم کسی صنف سے کوئی بیر نہیں ہے۔ میں تو محض اپنی تخلیقی تحریک کی پیروی کرتا ہوں جو نظم سے غزل اور پھر غزل سے نظم کی جانب مراجعت کرتی رہتی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ موجودہ دور کے پیچیدہ مسائل آسان زبان کے متقاضی نہیں ہیں، اور اسی لیے میں نظم پر غزل کو ترجیح دیتا ہوں۔

جون ایلیا کو اپنی شاعری کے مجموعوں کی اشاعت پر قدرے تامل تھا:

تقریباً چھ یا سات جلدیں اشاعت کے لیے تیار ہیں اور ان میں سے ایک اپریل تک شائع ہو جائے گا۔ میرے خیر خواہ چاہتے ہیں کہ وہ سبھی جلد سے جلد شائع ہو جائیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری کچھ نثری تصنیفات پہلے شائع ہوں۔

ان 'نثری تصنیفات' پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ حالاں کہ جون ایلیا ایک شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں لیکن ان کی عالمانہ حیثیت بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان کے کارنامے ان کے تراجم اور کلاسیکی عربی ادب کے مطالعات پر مشتمل ہیں جن میں حلاج اور اخوان الصفا شامل ہیں۔ آخرالذکر کی ذمے داری انھوں نے اوّلاً ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ورلڈ اسماعیلی سینٹر کے شعبۂ تحقیق و اشاعت کے لیے اپنی خدمات

کے دوران قبول کی تھی۔ بعد ازاں یہ کام ان کا شوق بن گیا۔

”میں (ورلڈ اسماعیلی) سینٹر میں اسلامی تاریخ اور فلسفے پر کام کیا کرتا تھا۔ میں نے اخوان الصفا کی خفیہ تنظیم کے مرتب کردہ انسائیکلوپیڈیا کی باون جلدوں کے اردو ترجمے کی تجویز پیش کی۔ وہ فاطمی عہد میں سرگرم تھے اور کسی وجہ سے انھوں نے اپنے ناموں کو پردۂ خفا میں رکھا تھا۔ تاہم، عام خیال کے مطابق وہ اسماعیلی تھے، اور اسماعیلی بھی ایسا ہی مانتے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ انسائیکلوپیڈیا روسو اور والٹیئر جیسے انقلابی مفکرین کے ساتھ ساتھ اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا اور لغت نگاروں کی ترغیب و تحریک کا باعث بنے۔ دراصل ان باون جلدوں میں علم الاعداد اور ریاضی سے لے کر علمِ نجوم، موسیقی اور پُراسرار علوم تک بہت سے متنوع موضوعات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ میں اس انسائیکلوپیڈیا کی تقریباً بیس جلدوں کا ترجمہ کر چکا تھا جب ۱۹۶۰ء کے اواخر میں اسماعیلی سینٹر کراچی سے لندن منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح یہ پروجیکٹ نامکمل رہ گیا۔ اور اس کے بعد میرے ترجمے کے مخطوطات کی پانچ جلدوں کے علاوہ باقی جلدیں گم ہوگئیں۔ حال ہی میں جب میں نے ذاتی طور پر انھیں شائع کرانے کا ارادہ کیا تو مجھے یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ پہلی جلد جس کا عنوان 'اعداد' تھا، کھوگئی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ بہرحال پہلی جلد پر کام شروع کروں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے از سرِ نو اس کا ترجمہ کرنا پڑے گا اور میں یہ کام پچیس دن میں انجام دے سکوں گا۔ لیکن اس کام میں اصل متن کی عدم دستیابی اڑچن بنی ہوئی ہے۔

ان کے مطالعے کا ایک اور اہم موضوع حلاج تھا۔ حلاج مسلمانوں کے دورِ حکومت کی تیسری صدی کے صوفی شہید تھے۔ اس مطالعے میں اٹھارہ سال کے عرصے اور تین سو سے زیادہ ماخذوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اشک آمیز آنکھوں کے ساتھ انھوں نے بتایا کہ ان کی محنت کا ثمر یعنی حلاج کے مخطوطات ان کی ذاتی زندگی کے حوادث کی بھینٹ چڑھ کر ضائع ہو گئے۔

حلاج کو اپنے مطالعہ کا موضوع چنتے وقت آپ کے ذہن میں ان کی کیا اہمیت تھی؟

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، حلاج ایک صوفی تھے اور دینِ کُل اور وحدت الوجود کے تصورات کے ساتھ انسان سے محبت تصوف کی روح ہے۔ دوسرے یہ کہ حلاج اپنے انقلابی سیاسی نظریات کے لیے بھی مشہور تھے۔ ندیم کی 'الفہرس' میں ان کی تقریباً تیس کتابوں کے نام شامل ہیں جن میں سے بیشتر کسی اور موضوع پر نہیں، سیاست پر ہیں۔ عام خیال کے برعکس، میں سمجھتا ہوں کہ انھیں تختۂ دار پر اس لیے چڑھایا گیا تھا کہ وہ عباسی حکمرانوں کے لیے سیاسی خطرہ بن گئے تھے۔ ''انا الحق'' کہہ کر خود کو خدا کہنے کا الزام تو محض ایک بہانہ تھا۔ مسلم معاشرہ اتنا متعصب کبھی نہیں رہا کہ کسی شخص کو محض ایسے کلمات زبان سے نکالنے کی بنا پر سولی پر چڑھا دیا جائے۔ اسی معاشرے نے اس سے پیشتر صوفی بایزید کی اس سے کہیں زیادہ ناگوار 'کفر آمیز' باتوں کو برداشت کیا تھا۔ ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ ایک موقعے پر انھوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''میں خدا سے بھی بڑا ہوں۔'' اس کے برعکس حلاج نے جو کچھ کہا تھا، اس کا مطلب

> بآسانی 'میں سچ ہوں' بھی نکالا جاسکتا تھا۔ ویسے یہ قول اُپنشد کے ایک جملے یعنی 'اہم برہما' یا 'میں برہما ہوں' کے ترجمے جیسا لگتا ہے۔ اگر حلاج نے اپنے دور کے حکمرانوں کے مفاد کے خلاف بعض سیاسی تبدیلیوں کا تقاضا نہیں کیا ہوتا تو انھیں کبھی سولی پر نہیں چڑھایا گیا ہوتا۔ اس عظیم صوفی میں میری دل چسپی بالخصوص ان کی سیاسی سرگرمیوں اور عقائد کی وجہ سے تھی۔

ڈرامے کے ذکر کے بغیر جون ایلیا کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ اصنافِ ادب میں ڈراما اُن کی دوسری پسند تھا۔

> مجھے سب سے پہلے اپنے آبائی وطن (امروہہ) میں شہرت حاصل ہوئی جب میری عمر بیس برس بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہ شہرت ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ڈراما نویس اور اداکار کے طور پر ملی تھی۔ میں طبع زاد ڈرامے لکھا کرتا تھا اور پھر انھیں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ اسٹیج کیا کرتا تھا۔ یہ عام طور پر تاریخی ڈرامے ہوا کرتے تھے جو مسلم دورِ حکومت کی ابتدائی صدیوں کے پس منظر میں لکھے جاتے تھے۔ ڈراما نویسی نے حقیقتاً غزل سمیت میری شاعری پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے کیوں کہ میرے اشعار اکثر مکالمے کا لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دراصل، اگر میں شاعر نہ ہوتا تو ڈرامے (خصوصاً تاریخی ڈرامے) کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بناتا اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے تاریخ اور فلسفے کا انتخاب کرتا۔

اس کے باوجود انھوں نے شاعری کو اپنا جنون بنالیا۔ یہاں ڈرامے کے بارے میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، انھیں ۱۹۹۰ء میں شائع ان کے مجموعے ''شاید''

کے دیباچے میں تحریر باتوں کو سمجھنے کے لیے پس منظر کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے:

میں انتہائی نیازمندانہ طور پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ڈراما اپنے جوہر میں شعری صنف کے اعتبار سے دوسرے درجہ کی صنف ہے۔

میں اپنے اس اذعانی انداز گفتگو پر معذرت خواہ ہوں۔

میں اپنی نوجوانی کے بعد سے اذعانیت اور ادعائیت کو ذہن کی فحاشی سمجھتا ہوں۔ میرا استدلال یہ ہے کہ ڈراما خیال کو کردار میں مجسم کرنے کا فن ہے اور خیال کے کردار کی صورت میں مجسم اور متخیل ہونے کا مطلب ہے، خیال کا اپنی توانائی کھو دینا۔ خیال ڈرامے کا ایک کردار بن کر ایک متعین مکان اور زمان سے متعلق ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک کلی اور وسیع الاطلاق خیالیہ، جزئی زمان اور جزئی مظہریت میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

پشاور میں ایک شام

جون بھائی کے متعلق اپنی بکھری ہوئی یادوں کو مربوط کرنے کی کوشش کروں تو ایک غیر منظم ترتیب کے ساتھ بہت سے جگنو ایک ساتھ جلنے بجھنے لگتے ہیں۔ قدرت کے تخلیق کیے ہوئے مناظر ہوں یا انسان کی بنائی ہوئی اشکال اور نقش و نگار۔ بے ترتیبی کا اپنا ایک حسن ہے اور شاید اس کی پرتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو ایک ترتیب وہاں بھی کار فرما ہوگی۔ انسانی ذہن جو خالق کی کرشمہ سازی اور انسانی تمثیل گری کا ایک نقطۂ اتصال ہے، بعض اوقات اسی منظم بے ترتیبی میں سہولت محسوس کرتا ہے۔ اور یہ بات تو ہے بھی جون بھائی کی۔ جو منتشر زندگی اور بے ترتیب طرزِ حیات کے بادشاہ تھے اور یہ طرز بھی ان کی شاعری کی طرح ان کا اپنا اختراع کردہ تھا اور اس میں بھی وہ اپنا اسلوب خاص رکھتے تھے۔ سو کچھ دیر کے لیے ذہن کی کلائیڈواسکوپ سے آنکھ لگا کر دیکھتا ہوں کہ کیسے کیسے منظر وہاں دکھائی دیتے ہیں۔

میں فلیٹیز ہوٹل کے یخ بستہ ہال میں بیٹھا ہوں۔ جون بھائی اسٹیج پر صاحبِ شام کی حیثیت میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ لاہور کی اکثر چھوٹی بڑی ادبی شخصیات انھیں سننے

کے لیے جمع ہیں۔ جون بھائی کی آواز اور ان کے لیے منعقد کردہ شام گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ ایک نظم آغاز کرتے ہیں اور لوگ لمحہ بہ لمحہ مصرع بہ مصرع اس نظم کی وسیع اور ساکت جھیل میں اترتے جاتے ہیں۔

مجھے اپنے بائیں جانب سے سسکیوں کی دبی دبی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں گردن موڑ کر اپنے ہم نشست اور باکمال شاعر دوست ڈاکٹر معین نظامی کو دیکھتا ہوں جس کے رخساروں پر اس نظم کے بھیگے ہوئے مصرعے روشن ہو رہے ہیں۔ میں دوسری جانب اپنے دوسرے ہم نشین دوست شعیب احمد کی طرف دیکھتا ہوں جو خود اعلیٰ شاعر ہے۔ شعیب کی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں بھی کسی نے شاید جلتے ہوئے موم کے قطرے ڈال دیے ہیں اور یہ موم کہیں منجمد ہو کر اور کہیں پگھل کر میرے عدسوں اور بصارت کو دھندلا کیے دے رہا ہے۔

میں گارڈن ایسٹ، کراچی کی ایک نیم ویران کوٹھی کے ایک اُجاڑ کمرے میں بیٹھا ہوں۔ کچھ ڈرا ہوا اور کچھ گھبرایا ہوا۔ ادب میں بھی نو وارد ہوں اور ان کے گھر میں بھی۔ جون بھائی اپنی شام کی مشغولیات آغاز کر چکے ہیں۔ ان کی چسکیوں کے درمیان میں اپنی غزلیں ان کی فرمائش پر انھیں سنا رہا ہوں۔ کسی غزل کے کسی شعر پر داد نہیں مل رہی۔ 'ایک غزل اور سناؤ' کی آواز ہر غزل کے اختتام پر ضرور آتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اگر انھیں میری شاعری اچھی لگ رہی ہے تو داد کیوں نہیں دیتے اور اگر اچھی نہیں لگ رہی تو مزید سنانے کی فرمائش کیسی ہے؟ چھٹی غزل کے اختتام پر آواز آتی ہے، ''چھوٹی بحر کی سناؤ!'' میں ان کی بات سمجھ جاتا ہوں۔ وہ میرا امتحان لے رہے ہیں۔ میں چھوٹی بحر کی کئی غزلیں اُن کی بھرپور داد و تحسین کے درمیان سناتا ہوں:

اب بھی وہ ہمیں ملا کہاں ہے
دیوارِ وصال درمیاں ہے

یہ شہر بلندیوں سے دیکھو
دریائے روا روی رواں ہے
دل سے تری یاد اتر رہی ہے
سیلاب کے بعد کا سماں ہے

جون صاحب سے بہت غیر معمولی داد مل رہی ہے۔ وہ میری تمام شاعری پر بھرپور ستائشی کلمات کہہ رہے ہیں۔ اور اس سے قبل داد نہ دینے کی وجہ اپنے مخصوص انداز میں بتا رہے ہیں۔

ارے جانی تو کیا سمجھا تھا؟ مجھے کیا شعر کی سمجھ نہیں ہے؟ میں کیا الو کا پٹھا ہوں؟ تیرے شعر سمجھ نہیں آ رہے تھے مجھے؟ ارے میں تو دیکھ رہا تھا کہ کتنی غزلوں میں دم خم دکھاتا ہے تُو۔ ایک دو غزل اچھی کہہ لینا اور بات ہے۔ اور چھوٹی بحر تو قیامت ہے قیامت۔ سانس پھول جاتی ہے آدمی کی۔ تُو تو کمال شاعر ہے— جا کہہ دیا میں نے، اوروں سے جا کر کہہ دے تو بھی۔ میاں سانس پھول جاتی ہے سانس۔

اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ ان غزلوں کے درمیان داد دیتے تو شاید اتنی سیر حاصل داد نہیں مل سکتی تھی جو اب مل گئی ہے۔

ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے۔ یہ مصرع ان کی ایک اور یاد پر کلک کر کے اسے روشن کر دیتا ہے۔ جیسے نقرئی اسکرین پر یکا یک ایک رنگا رنگ منظر روشن ہو جائے اور نیم تاریک گرد و پیش اس میں ضم ہو جائیں۔

لاہور کے ایک پبلشر کے دفتر میں جون صاحب بیٹھے ہیں۔ انھیں ان کے مداحوں نے گھیرا ہوا ہے جو اپنے اپنے مداح بھی جون صاحب سے ملوانے لائے ہوئے ہیں— جون صاحب شعر سنا رہے ہیں:

آپ اپنے سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں سانس پھول جاتی ہے

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے
کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

جون صاحب رو رہے ہیں۔ آج ان کے مصرے خود انھی کے رخساروں پر پھسل رہے ہیں۔ ان شعروں سے ان کی کون سی یاد کون سا دکھ وابستہ ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ کسی دکھ نے ان سے یہ شعر کہلوائے ہیں اور پڑھتے وقت کوئی دکھ ان شعروں کو خنجر کی طرح ان کے دل میں اتار رہا ہے۔

اورینٹل کالج، لاہور کے ایک مشاعرے کے لیے جون صاحب کو لینے میں اور معین نظامی جون صاحب کی اقامت گاہ پر پہنچے ہوئے ہیں۔ جون صاحب تیار ہو رہے ہیں۔ جن کے گھر میں قیام ہے، وہ خاتونِ خانہ شاید جون صاحب کی عزیزہ ہیں۔ وہ جون کی صحت پر کڑھ رہی ہیں۔ ارے بھیا خدا کے لیے خود اپنا خیال کرو۔ یہ زخم ٹھیک نہیں ہو رہا۔ ذرا دیکھو تو سہی۔ وہ جون صاحب کی پنڈلی پر ایک زخم کی نشان دہی کر رہی ہیں جو اندمال کی منزلوں سے کافی دور ہے۔ ہم جون بھائی کا یہ شعر یاد کر رہے ہیں:

جانے مجھ سے یہ کون کہتا تھا
آپ اپنا خیال تو رکھیے

جون صاحب ایک لفظ کہے بغیر تیار ہو رہے ہیں۔ جیسے ایک چھوٹا سا بچہ جسے اس کی ماں اس کی لاپروائی سے عاجز آ کر ڈانٹ رہی ہو۔

گلستانِ جوہر کراچی نیا نیا آباد ہوا ہے اور اس آبادی میں شاید یہ پہلا مشاعرہ ہے۔ کراچی کے تقریباً تمام سینئر جونیئر نمائندہ شاعر موجود ہیں۔ میں کراچی میں موجودگی کے سبب اس مشاعرے میں موجود ہوں۔ جناب رضی اختر شوق سے یہ میری پہلی ملاقات ہے۔ مشاعرہ ابھی شروع ہی ہوا ہے۔ چھ، سات، نو وارد اپنی شاعری سنا چکے ہیں کہ جون

صاحب اچانک اٹھ کر مائیک پر آجاتے ہیں۔ ''اب ہم پڑھیں گے۔'' تمام شاعر اور سامعین ہکا بکا ہیں۔ ناظمِ مشاعرہ سراپا احتجاج ہے، ''جون صاحب آپ کو تو اپنے مقام پر پڑھنا ہے۔'' لیکن جون صاحب مصر ہیں — وہ کسی کی بات نہیں سن رہے۔ ناظمِ مشاعرہ کیا کسی اور میں بھی اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ ان کی بات ٹال سکے — وہ اپنا کلام پڑھتے ہیں۔ حسبِ معمول فرمائشوں پر فرمائشیں ہو رہی ہیں اور وہ اپنے مخصوص والہانہ پن سے اپنی نئی اور پرانی غزلیں سنا رہے ہیں:

یہ غم کیا دل کی عادت ہے؟ نہیں تو
کسی سے کچھ شکایت ہے؟ نہیں تو
کسی صورت بھی دل لگتا نہیں؟ ہاں
تو کچھ دن سے یہ حالت ہے؟ نہیں تو

اور:

یہاں میں ذکر نہیں کر رہا مکینوں کا
کبھی کبھی در و دیوار مرنے لگتے ہیں

ان کے جونیئر ان کے بعد اپنا کلام سناتے ہیں لیکن پہلے ہو یا بعد میں، جون صاحب مشاعرہ لوٹ چکے ہیں۔

اب تصویریں تیزی سے چل رہی ہیں جیسے ایک لڑی میں پرو دی گئی ہوں — لکشمی چوک کے نیشنل ہوٹل میں، میں نے کافی احباب کو کھانے پر مدعو کیا ہوا ہے۔ جون بھائی کے اعزاز میں دعوت ہے۔ لیکن جون صاحب آ ہی نہیں چکتے۔ انتظار طویل ہو چکا ہے۔ بالآخر جون صاحب آتے ہیں۔ میرے ماتھے کی شکایتی شکنیں دیکھتے ہیں اور اپنے میٹھے لہجے میں کہتے ہیں، ''مسعود جانی صرف تیری وجہ سے آیا ہوں قسم سے۔ ورنہ شاعری اور شاعروں سے میرا کیا واسطہ، کیا تعلق — اب شکایت چھوڑ، کھانا کھلا۔'' میں ہنس پڑتا ہوں۔ جون صاحب کے دستِ راست انیق مسکرا رہے ہیں۔ بعد میں وہ بتاتے ہیں کہ

جونؔ صاحب ڈراما نہیں کر رہے۔ واقعی درست کہہ رہے ہیں۔ جس محفل سے بلکہ جس طرح کی من پسند محفل سے وہ اٹھ کر آئے ہیں، وہاں سے آنا واقعی مشکل تھا۔

عکسِ رواں آب رواں کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں۔ جون صاحب اپنے مداحوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ کہہ رہے ہیں، یارو! یہاں لاہور میں ایک شاعر ہے (وہ ایک نوجوان شاعر کا نام لیتے ہیں) اس کی فرمائش پر میں نے اس کے مجموعے کا دیباچہ لکھا۔ اس...نے وہ دیباچہ تو چھاپ دیا لیکن اس میں تحریف کردی۔ ایک دو جملے نکال دیے — اس حرکت کے باوجود وہ چل پھر بھی رہا ہے۔ ہنس بول بھی رہا ہے حتیٰ کہ سانس بھی لے رہا ہے۔ اور کوئی شخص کچھ نہیں کرتا۔ حیف ہے بھئی، حیف ہے۔

اب میں جون صاحب کو غزل سنا رہا ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں۔ بھئی یہ ''کی مانند'' نہیں ہوتا۔ یاد رکھ جانی ''کے مانند'' ہوتا ہے۔

ایک تصویر اٹک گئی ہے۔ اور ایک فریم اسکرین پر ٹھہر گیا ہے۔ جون صاحب کا کلوز اپ — لاہور میں ایک صاحبِ علم شاعر کے گھر جون صاحب مدعو ہیں۔ اپنا رجسٹر طلب کرتے ہیں اور ایک نظم سناتے ہیں جس کا رزمیہ اور رجزیہ آہنگ انتہائی زوردار ہے۔ شاید یہ نظم کبھی چھپی نہیں اور کسی سے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں سنا۔ جون صاحب ویسے ہی حالتِ وارفتگی میں ہیں، کچھ سامعین کی پُر زور داد، کچھ نظم بھی ان پر طاری ہے۔ وہ ایک حالتِ حال میں اُٹھتے ہیں اور قریبی دیوار سے زور سے اپنا سر ٹکراتے ہیں۔ شوریدہ سری اور دیوار کا جو تعلق ہے، وہ حاضرین بھی جانتے ہیں اور خود صاحبِ کلام بھی۔ ہوشؔ ترمذی کا شعر یاد آ رہا ہے:

ایک دیوار ہے زندگی\
کوئی شوریدہ سر چاہیے

عکس پھر سے متحرک ہو گئے ہیں۔ ان سب شبیہوں میں ایک شبیہ ایسی ہے جو

چالاکی سے عبارت ہے۔ جون صاحب کو شعر سنانے پر مائل کیا جارہا ہے— یہ جو بحر ہے نا رجز مثمن مطوی مخبون (مفتعلن مفاعلن، مفتعلن مفاعلن) جس کے بارے میں جون بھائی نے لکھا ہے کہ ہمارے گھر کے در و دیوار اس بحر پر صبح و شام جھوما کرتے تھے، اس میں جون صاحب کی غزل جو حال ہی میں ''فنون'' میں چھپی ہے، میں دوستوں کے درمیان ان کے سامنے پڑھ کر داد دے رہا ہوں:

شہر بہ شہر کر سفر، زادِ سفر لیے بغیر
کوئی اثر کیے بغیر، کوئی اثر لیے بغیر
کچھ بھی ہو قتل گاہ میں، حسنِ بدن کا ہے ضرر
یاں سے نہیں ٹلوں گا میں، دوش پہ سر لیے بغیر
قریۂ گریہ میں مرا گریۂ بے سخن ورانہ ہے
میں نہ یہاں سے جاؤں گا دادِ ہنر لیے بغیر

ان کے سامنے پڑھنے کا مقصد یہی ہے کہ ان کی طبیعت موج پر آجائے اور اس میں مزید غزلیں ان کی زبان سے سننے کا موقع مل سکے۔ طریقہ کارگر ہوتا ہے اور ان کے در و دیوار اس بحر پر جھومنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس بحر میں جون صاحب نے ایک سے ایک قاتل شعر کہا ہے۔ ایسا کہ یہ بحر گویا اپنی کر لی۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس بحر کا ذکر آئے اور جون کے شعر یاد نہ آئیں:

جو بھی ہو تم پہ معترض اس کو یہی جواب دو
آپ بہت شریف ہیں، آپ نے کیا نہیں کیا
تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہو غالباً
میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا، اور ملال بھی نہیں

شور اٹھا مگر تجھے لذتِ گوش تو ملی
خون بہا مگر ترے ہاتھ تو لال ہو گئے
ہم نفسانِ وضع دار، مستمعانِ بردبار
ہم تو تمھارے واسطے ایک وبال ہو گئے

اپنے سبھی گلے بجا، پر ہے یہی کہ دلربا
میرا ترا معاملہ عشق کے بس کا تھا نہیں
جائیے خود میں رائگاں اور وہ یوں کہ دوستاں
ذات کا کوئی ماجرا شہر کا ماجرا نہیں

شاید جون بھائی کا دکھ یہی تھا کہ ذات کا کوئی ماجرا شہر کا ماجرا نہیں۔

ماجرا کے لفظ کا استعمال تو جون بھائی پر ختم تھا۔ اس لفظ کو پُر اثر اور ایسا پُر ماجرا بنا دینا کیا کسی اور کے لیے ممکن تھا۔

عکس ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آرہے۔ تصاویر ہیں کہ ایک کے بعد ایک کھنچی چلی آرہی ہیں۔ ان کے خدوخال واضح اور رنگ تازہ ہیں جیسے کسی نے وقت کو منجمد کر دیا تھا اور آج ایک اشارے سے یہ ساکت وصامت وقت سیال اور متحرک ہو گیا ہے۔

جون صاحب شعر سنا رہے ہیں:

اک نہ اک بات سب میں ہوتی ہے
وہ جو اک بات تجھ میں تھی، کیا کی؟

تیری ہر بات اب حساب سے ہے
بے حسابی کی زندگی کیا کی؟
شش جہت آئنوں کے بیچم بیچ
تو نے اپنی وہ بے رخی کیا کی؟

سب اس لفظ بیچم بیچ کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ جون صاحب کے انداز سے ظاہر ہے کہ وہ اس داد کا لطف اٹھا رہے ہیں۔

یہ جو بیچم بیچ اور بے رخی کے الفاظ کا نادر استعمال ہے، یہ کون کرے گا جون کے سوا؟ افسوس کہ یہ غزل جب کتاب میں شامل کی گئی تو یہ شعر اس میں سہواً یا ارادتاً نکال دیا گیا۔ بیچم بیچ کا لفظ میں نے اس سے پہلے شاعری میں کبھی نہیں سنا، حالاں کہ میری نانی اور والدہ یہ لفظ بولا کرتی تھیں۔ اور سچ یہ ہے کہ اس کے بجائے بیچوں بیچ لگا دیں تو بات ہی نہیں بنتی۔

ایسے لفظ برتنے کے لیے ایک حوصلہ درکار ہے جو یا صرف لغت میں ملتے ہیں یا بزرگوں کی زبان میں۔ اور جون بھائی ایسے لفظ نئے نکور کر کے جھاڑ پونچھ کر شاعری کے حوالے کر دیتے تھے — نہیں کی متروک شکل نئیں کو انھوں نے زندہ کیا:

مرا اک مشورہ ہے التجا نئیں
تو میرے پاس سے اس وقت جا نئیں
سفر درپیش ہے اک بے مسافت
مسافت ہو تو کوئی فاصلہ نئیں

اور پھر یہ چل نکلا۔ ہر خاص و عام نے اسے ہر جگہ استعمال کیا خواہ وہاں یہ جچتا بھی نہ ہو۔ اس کے لیے تو مزاج چاہیے تھا۔ اور وہ مزاج داں جون ایلیا تھے۔ جون صاحب کو ایسے الفاظ کا بڑا ادراک تھا۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

میں خود میں جھینکتا ہوں اور سینے میں بھڑکتا ہوں

یہاں ذرا جھینکنا کا لفظ دیکھیں۔ کم از کم میرے علم میں موجودہ شاعری میں اس کی مثال نہیں ہے۔ چناں چہ جب وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو یہ ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں۔

یادوں کی ان ساکت و متحرک فلموں میں ایک فلم ایسی بھی ہے جہاں جون صاحب موجود نہیں ہیں۔ صرف ان کی شاعری موجود ہے۔ جون صاحب کی ایک غزل ہے جس کا ایک مصرع اور تین شعر یاد آ رہے ہیں:

یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے وہاں تو کچھ بھی نہیں

کسے خبر سرِ منزل جو دل نے حال سہے
اذیتِ سفرِ رائگاں تو کچھ بھی نہیں

سہے ہیں میں نے عجب کرب سود مندی کے
گلہ ہے تجھ کو زیاں کا، زیاں تو کچھ بھی نہیں

اس میں کیا عجیب شعر ہے۔ سنتے جائیے، سر دھنتے جائیے—

درونیانِ تسلّی سے تو ملا ہے کبھی؟
عذابِ حسرتِ بیرونیاں تو کچھ بھی نہیں

یہ درونیانِ تسلی، یہ برونیانِ حسرت زدہ۔ یہ کن منزلوں کی ترجمانی ہے۔ یہ الفاظ نہیں معنی ہیں۔ اور معنی بھی وہ جو ان منزلوں سے گزرنے والے جون ایلیا پر روشن تھے۔ وہ تو ایک منزل پر پہنچ کر معنی کے بھی انکاری تھے۔

کوئی معنی نہیں کسی شے کے
اور اگر ہوں بھی تو میاں تب کیا

جون صاحب پڑھتے تھے تو ان کے انداز پر اصغر گونڈوی کا وہ مصرع یاد آتا تھا:

کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

وہ جس والہانہ اور وارفتہ انداز میں شعر پڑھتے تھے وہ انھی سے مخصوص تھا اور یہ انھی کے زبان سے مزہ بھی دیتے تھے۔ اس کی نقل کرنے والے بعد میں کئی آئے لیکن جون صاحب اپنی پڑھت میں یکتا ہی رہے اور یکتا ہی رہیں گے۔

اسی طرح مصرع سازی میں کچھ پیرایے، کچھ اسالیب، کچھ انداز تو ایسے ہیں کہ وہ جون صاحب ہی کے دم سے تھے اور سچ یہ ہے کہ سجتے بھی انھی کو تھے۔

میں اور خود کو تجھ سے چھپاؤں گا یعنی میں
لے دیکھ لے میاں مرے اندر بھی کچھ نہیں

میں انھیں چشمِ تصور سے اپنی نہایت منفرد اور کمال نظم "درختِ زرد" میں اپنے بیٹے زریون سے مکالمہ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں:

تمھارا باپ یعنی میں، عبث میں، اک عبث تر میں
مگر میں، یعنی جانے کون؟ اچھا میں، سراسر میں

میں کبھی کبھی جون بھائی کے یہ شعر یاد کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یہ شعر انھوں نے کس کے لیے کہے تھے۔ پھر میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ تو کسی کے لیے بھی نہیں تھے۔ یہ تو ان کا خود اپنے آپ سے خطاب تھا۔ یہ تو خود کلامی تھی:

حساب دارئ سود و زیاں سے چل نکلو
میاں یہاں کی نہیں اور ہاں سے چل نکلو
مری سنو تو زمان و مکاں میں رہتے ہوئے
بصد سلیقہ زمان و مکاں سے چل نکلو

سو، وہ اس زمان و مکان سے اس سلیقے سے رخصت ہوئے کہ سال ہا سال

گزرنے کے بعد بھی یقین ہی نہیں آتا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔

یادوں کے پیڑ تلے بہت سے سرخ، آتشی، نارنج و زرد پتوں کا ایک ڈھیر لگا ہے— میں اس پشاور میں کھڑا ہوں۔ ہر پتا ایک لمحہ ہے۔ ہر ایک پر تصویر ہے اور ہر تصویر جون ایلیا کی ہے۔ ہنستے روتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، بولتے اور غم گھولتے ہوئے جون ایلیا۔ وہ کہاں گئے ہیں اتنی یادوں، اتنی تصویروں کے ہوتے ہوئے۔

خود انھوں نے ہی تو کہا تھا:

ہم سے بے واسطہ نہیں ہے وہ
وہ یہیں تھا، یہیں کہیں ہے وہ

○

عرفان ستار

نادرِ روزگار تھے ہم تو

جون ایلیا کی تخلیقی شخصیت پر ہمیشہ اُن کی ذاتی شخصیت کا غلبہ رہا۔ ادبی دنیا کی اُن کے ساتھ ایک love-hate relationship رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شخصیت تو موضوعِ گفتگو رہی، مگر ان کی شاعری کو کبھی objectively پڑھا ہی نہ گیا۔ میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ بیشتر نقادوں اور زیادہ تر شعرا کو جون ایلیا کے دس پندرہ سے زیادہ اشعار نہ یاد ہیں، نہ انھوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ کتنا بڑا آدمی ان کے سامنے سے ہو کر گزر گیا۔ حیرت کا مقام ہوتا ہے جب جون صاحب کا تقابل ایسے شعرا کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کا نہ اپنا لہجہ ہے، نہ ہی انھوں نے اپنی یا اپنے بعد آنے والی نسل پر کوئی گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اور اس وقت بھی مجھے حیرت ہوتی ہے جب اس عہد کے اہم ترین شعرا کی فہرست میں جون صاحب کا نام اکثر شامل ہونے سے رہ جاتا ہے۔

خیر جو ہوا سو ہوا۔ جون ایلیا اچھا شاعر نہیں ہے۔ جون ایلیا بہت اچھا شاعر بھی نہیں ہے۔ جون ایلیا بہت اہم شاعر بھی نہیں ہے۔ جون ایلیا تقسیمِ ہندوستان کے بعد سے آج تک کے سب سے بڑے شاعروں میں سے ایک ہے۔ گویا کن شعرا کے ساتھ

میں انھیں شمار کررہا ہوں؟ فیض، راشد، مجید امجد، اور عزیز حامد مدنی۔ جون ایلیا میری نظر میں ان چاروں کے ساتھ وہ پانچواں بڑا شاعر ہے جس نے اردو شاعری کے گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں پر اپنے گہرے اور اَن مٹ نقش ثبت کیے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں، اگر میں اس کے حق میں ناقابلِ تردید دلائل نہ پیش کرسکا۔ مگر مجھے اس بات کی کوئی فکر اس لیے نہیں کہ جون ایلیا کی شاعری ایسے کسی بھی دعویٰ کے حق میں دلائل سے بھری پڑی ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے ان جملوں پر بہت سے لوگ یہ کہیں گے کہ "حد ہوگئی۔ جون ایلیا اور بڑا شاعر؟ ایک چھوٹے سے دائرے میں گھومنے والی شاعری اور بڑی؟ کیا بیوقوفی کی بات ہے۔" اس پر میرا جواب یہ ہے کہ جون کی شاعری ایک چھوٹے سے دائرے میں نہیں گھومتی۔ آپ کا ذہن گھومتا ہے۔ آپ نے جون ایلیا کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے جس میں دس پندرہ اشعار فٹ ہوتے ہیں۔ باقی پر آپ غور کرنے کی یا تو صلاحیت نہیں رکھتے یا ہمت سے محروم ہیں۔

ہمت کی بات کہاں سے آگئی؟ ہمت ہی کی تو بات ہے۔ وہ تمام نقاد اور شاعر جو جون ایلیا کے ہم عصر ہیں، ان سب سے میرا یہ مضمون ایک سوال کررہا ہے۔ اور سوال یہ ہے کہ جناب جون ایلیا جیسے شاعر کو اس کا جائز مقام نہ دینا آپ کی مصلحت تھی، یا شعر فہمی اور بصیرت کی کمی؟ کیا آپ کے خیال میں اس سوال کا جواب آسان ہے؟ آسان نہیں ہے۔ یہ ان نام نہاد سکہ بند نقادوں اور بزعم خود صاحبانِ علم سے تقاضا ہے کہ یا تو جون ایلیا کو اس مسندِ فضیلت پر بٹھائیں جو ان کے لیے بنی تھی، یا یہ ثابت کریں کہ جون ایلیا اس مسند کے قابل نہیں ہے، یا اپنا جرم قبول کریں۔ بہرصورت جواب دینا اُن کا فرض ہے۔

چلیے اب یہ طے کیجیے کہ بڑا شاعر کون ہوتا ہے؟ میرے نزدیک بڑی شاعری کے چار بنیادی عناصر ہیں۔ بڑی شاعری کے عناصرِ اربعہ کہہ لیجیے:

۱۔ زبان کی درستی، ذخیرۂ الفاظ اور الفاظ کو برتنے کا سلیقہ

۲۔ مضمون آفرینی اور ندرتِ خیال

۳۔ قدرتِ اظہار

۴۔ شعریت

ان چار عناصر کی موجودگی ہی کسی شاعر کی بڑی شعری روایت سے وابستگی، اس کے اپنے عہد پر اثرات، اور اس کے بعد آنے والوں کے تخلیقی سفر میں ان کی رہنمائی کو یقینی بناتی ہے۔

یہاں تک لکھا تھا کہ جون صاحب کی ایک بات یاد آگئی اور میری انگلیاں ٹائپنگ کرتے ہوئے اچانک جم سی گئیں——

"جانی! اگر کہیں مجھ سے محبت کرنے والے جمع ہوں تو تیرا صرف ایک کام ہے۔ انھیں میرے شعر سنانا۔ جیسے تُو میرے شعر پڑھتا ہے، ویسے انھیں کوئی نہیں سنا سکتا۔ تیرا جون بھائی مقالوں کا موضوع نہیں ہے۔ مقالہ نگاروں کے لیے تو جون ایلیا ہمیشہ ایک مسئلہ شاعر رہے گا۔ انھیں اس مسئلے سے اُلجھنے دے۔ تُو میرے شعر سنایا کر۔ میں اپنی شاعری میں زندہ ہوں۔ اسے زندہ رکھ تو سمجھ کہ میں زندہ رہوں گا۔"

بات سمجھ آگئی۔ جون بڑا شاعر اس لیے نہیں کہ وہ ان تمام کسوٹیوں پر کھرا اتر سکتا ہے جو صدیوں کی شعری روایت اور تنقیدی معیارات کے تحت قائم ہوئی ہیں۔ جون بڑا شاعر اس لیے ہے کہ شاعری کے سب سے بڑے موضوع، یعنی انسان کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیات پر جیسے اشعار جون ایلیا نے کہے ہیں، اردو شاعری کی روایت میں اُس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جون ایلیا بڑا شاعر اس لیے ہے کہ کیفیت کو ایک شدید ترین احساس کی صورت میں قاری یا سامع تک منتقل کرنے کی جو صلاحیت جون کے یہاں ہے، اردو شاعری میں اس کی مثال صرف میر کے یہاں ملتی ہے۔

جون ایلیا کے ساتھ دو بڑے ظلم ہوئے۔ اوّل یہ کہ انھیں ''شاید'' کے بعد اپنا کلام منتخب کرنے کا موقع نہ ملا، اور نتیجتاً ان کا نسبتاً کمزور کلام بھی ان کے مجموعوں میں شامل ہوگیا۔ جون صاحب بہت زُود گو شاعر تھے اور روز بہت کچھ کہتے تھے۔ مگر ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کا وہ کلام بھی شائع کردیا جائے گا جو اُن کے لیے مشق، تجربے، یا بسا اوقات محض وقت گزاری کے ایک مشغلے کے ضمن میں آتا ہے۔ جون سراپا شاعر تھے اور شاعری کے سوا کچھ کرنا انھیں نہیں آتا تھا۔ لہٰذا وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ کبھی پھاڑ دیتے تھے، کبھی رکھ چھوڑتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''شاید'' کے مقابلے میں ان کے باقی تمام مجموعے نسبتاً کمزور لگتے ہیں۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ انھیں اچھا قاری تو ملا مگر اچھا نقاد نصیب نہ ہوا۔ ان کے سینئرز اور ہم عصر نقادوں نے زبانی کلامی تو انھیں بہت سراہا، مگر ان کے کلام کی بڑائی کا تحریری طور پر اعتراف نہ کیا۔ آج بھی ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کوئی صاحب جون صاحب کے دس پندرہ ''ناف پیالہ'' والے اشعار پکڑ کر انھیں ایک بیمار، برا، اور نیم پاگل شاعر قرار دے کر تالیاں بجاتے نظر آتے ہیں۔

رابرٹ فراسٹ نے کہا تھا کہ Poetry is what is lost during translation.— آخر کیوں؟ ایسا کیا ہے جو الفاظ میں منتقل ہونے سے رہ جاتا ہے؟ اس کا جواب ہے کیفیت۔ وہ کیفیت جو شعر کے الفاظ اور ان کے معانی میں نہیں، ان کے باہم ملاپ سے پیدا ہونے والی ایک ایسی حقیقت ہے جسے سمجھایا نہیں جاسکتا۔ صرف محسوس کروایا جا سکتا ہے۔ آج میں آپ کو جون ایلیا کے احساس میں شریک کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ وہ اشعار ہیں جو رابرٹ فراسٹ کے بیان کردہ معیار کا کامل نمونہ ہیں۔ ان کی تشریح میں وہ کیفیت آ ہی نہیں سکتی جو ان اشعار کے دو مصرعوں میں موجود ہے۔ ان اشعار کو سن کر اگر آپ کے منہ سے واہ اور دل سے آہ نکلے تو مجھے جون ایلیا زندہ ہے، اور زندہ رہے گا۔ اشعار کے انتخاب کا معیار میرا حافظہ ہے۔ جون ایلیا ان

شاعروں میں سے نہیں جن کے یہاں اچھے اشعار ڈھونڈنے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ جون کے یہاں تو ایک انبار لگا ہوا ہے، ایسے اشعار کا جن میں سے ایک ایک کے ساتھ پوری پوری رات گزاری جا سکتی ہے۔ آیئے اور میرے ساتھ جون ایلیا کی شاعری سے اپنے احساس کو مہمیز کریں:

کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

کسی محبت کرنے والے کے لیے اس سے زیادہ روح فرسا کیفیت اور کیا ہوگی کہ اس کے محبوب کے خال و خط اُس کے حافظے میں دھندلانے لگیں۔ اور پھر اس کا ایسا اظہار کہ ''کیا ستم ہے...'' ایسے دل میں جا گڑے کہ منہ سے بے اختیار آہ نکلے۔ یہ کیفیت نئی ہرگز نہیں ہے۔ اس کیفیت کا ایسا اظہار صرف جون ایلیا کے یہاں ملتا ہے:

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا؟
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا؟

بھری پری دنیا میں ایک ہی شخص دنیا کیسے بن جاتا ہے، یہ عشق کرنے والے جانتے ہیں۔ مگر ایسا اظہار اردو شاعری میں کتنی بار ہو سکا ہوگا؟ یہ قدرتِ کلام کا لازوال نمونہ ہے جس کے لیے بھاری بھرکم الفاظ کی نہیں بلکہ عام الفاظ کو ایسے باکمال انداز سے برتنے کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک خاص صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں:

گرم جوشی اور اس قدر، کیا بات
کیا تمھیں مجھ سے کچھ شکایت ہے؟

کیا بات ہے۔ کیسی نازک behavioral complexity کو کیسے شعر میں ڈھالا ہے جون صاحب نے۔ یا یہ شعر دیکھیے:

مل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ
مجھ کو یکسر بھلا چکی ہو کیا؟

یہ اردو شاعری میں بالکل مختلف مزاج کے اشعار ہیں۔ یہ ان کیفیات کے اشعار ہیں جن سے انسان گزرتا تو تھا، مگر کوئی ایسا شاعر جون ایلیا سے پہلے نہ تھا جو ان کیفیات کو شاعری کے قالب میں ڈھال سکتا:

کیا کہا؟ عشق جاودانی ہے
آخری بار مل رہی ہو کیا؟

کیا جواب ہو اس شعر کا؟ کیا داد دی جائے۔ ایک سوال اور اس کے جواب میں ایک اور سوال — اور کیفیت ایسی کہ بس قیامت:

عشق کو درمیاں نہ لاؤ، کہ میں
چیختا ہوں بدن کی عسرت میں

اب میرے مخاطب وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جون بیمار ذہن کا شاعر ہے۔ رانوں، پستانوں اور ناف پیالوں پر شعر کہتا ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ بیمار جون نہیں، آپ ہیں۔ آپ کو انسان کی نفسانی خواہشوں اور فطری جذبات سے خوف آتا ہے، اس لیے آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ جون اس پہلو کو انسانی وجود کی ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتا ہے، اس لیے اس کے بیان اور اس سے متعلق کیفیات کے اظہار میں جھجکتا نہیں۔ یہ کہنے کا حوصلہ کسی معمولی انسان میں ہو ہی نہیں سکتا کہ عشق کو درمیاں نہ لاؤ — یہاں تو خالصتاً جسمانی تعلق کو عشق تصور کر کے کتابوں کی کتابیں لکھ دی جاتی ہیں۔ اور یہ شخص ہے کہ کہتا ہے، چیختا ہوں بدن کی عسرت میں؟ یہ اردو شاعری میں ایک بالکل تازہ لہجہ اور طرزِ احساس و اظہار ہے:

میں اُسی طرح تو بہلتا ہوں
اور سب جس طرح بہلتے ہیں

بظاہر سادہ نظر آنے والا یہ شعر ایک ایسے انسان کی نفسیاتی کیفیت کی بھرپور

ترجمانی ہے جسے اس کے مختلف رویوں اور زندگی کے حوالے سے مختلف نظریات کی بنا پر Alien سمجھا جائے جس سے دوری اختیار کرلی جائے۔ جب کہ وہ بے چارہ اندر اندر گھٹتا ہو اور چیختا ہو کہ میں اُسی طرح تو بہلتا ہوں—ہائے ہائے— کیا ظلم ہے:

وہ خلا ہے کہ سوچتا ہوں میں
اُس سے کیا گفتگو ہو خلوت میں؟

وہ خلا ہے—اور اس کا اثر خلوت پر—خلا—خلوت— کچھ سمجھے صاحبان؟ یہ شاعری کی کتابیں نہیں شاعروں کے لیے Instruction Manuals ہیں، اگر کوئی سیکھنا چاہے:

اب فقط عادتوں کی ورزش ہے
روح شامل نہیں شکایت میں
یہ کچھ آسان تو نہیں ہے کہ ہم
روٹھتے اب بھی ہیں مروّت میں

آج ہم اپنے آپ سے سچ بولیں تو ہم میں سے کتنے ہی لوگ ہوں گے جو فقط عادتوں کی ورزش میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مصلحتوں کو مجبوریوں کا نام دیے جا رہے ہیں۔ کسی نامعلوم کے خوف سے معلوم کو جھیل رہے ہیں۔ یہ انوکھی بات نہیں۔ انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ اکثریت کا احوال ہے۔ مگر اسی احوال کو زبان نہ ملتی تھی۔ یہ جون ایلیا ہی کا کمال ہے کہ اس سادگی سے سب کچھ کہہ گئے کہ:

دکھ اٹھاتا ہوں میں رفاقت کے
تم نہیں ہو مری طبیعت کے

اب ذرا روح کے شکایت میں شامل نہ ہونے اور مروّت میں روٹھنے کی کربنا کی کو محسوس کیجیے۔ آپ کو جون ایلیا پر بے اختیار پیار آئے گا:

تو کیا اب نیند بھی آنے لگی ہے؟

تو بستر کیوں بچھایا جا رہا ہے؟

یہ شعر قدرتِ اظہار کا ایک نادر نمونہ ہے۔ تو کیا اب نیند بھی آنے لگی ہے؟ اس سوال کے پیچھے ایک پوری داستان ہے جس کے نتیجے میں پوچھنے والے کو حیرت ہو رہی ہے کہ تو کیا اب نیند بھی آنے لگی ہے؟ پھر دو مصرعوں کے درمیان کہیں "نہیں" لکھا ہوا ہے جو لفظوں میں ظاہر نہیں ہوا، مگر پوچھنے والے کے دوسرے سوال میں موجود ہے— تو بستر کیوں بچھایا جا رہا ہے؟ یہ غیر معمولی شاعری ہے جناب:

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے؟

روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

کس گھر کی بات ہو رہی ہے؟ جی ہاں۔ اس گھر کی بھی جو باہر آباد ہے اور جس کو سنبھالنا ایک اپنے اندر رہنے والے شخص کے لیے کارِ دارد ہے۔ اور اس گھر کی بھی جو اندر آباد ہے، جسے دل کہتے ہیں، جس پر قیامتیں گزری ہیں، اور آج بھی کوئی دن جاتا ہوگا جب اس دل میں کسی یاد کی آندھی ہلچل نہ مچائے اور کچھ ایسا ٹوٹ نہ جائے جو اب تک سلامت تھا۔ اندر کی دنیا جون کی دنیا ہے۔ اور اس دنیا کا جیسا احوال جون نے لکھا وہ جون ہی کا حصہ ہے:

یادیں ہیں یا بلوہ ہے؟

چلتے ہیں چاقو مجھ میں

یہ شعر کسی بھی حساس انسان کو رُلا سکتا ہے۔ تڑپا سکتا ہے۔ اور ہر ہر بار جب یہ شعر پڑھا جائے تب تب ایسا ہی ہو سکتا ہے کہ ان اشعار کی تاثیر دُہرانے سے گھٹتی نہیں، بڑھتی ہے:

تم میری اک خودمستی ہو، میں ہوں تمھاری خود بینی

قصے میں اس عشق کے ہم تم، دونوں بے بنیاد ہوئے

یہاں جون صاحب ہی کی ایک تین مصرعوں پر مبنی نظم یاد آ گئی:

وہ میرا خیال تھی، سو وہ تھی

میں اُس کا خیال تھا، سو میں تھا

اب دونوں خیال مر چکے ہیں

جب دونوں خیال مر گئے تو کیا رہ گیا؟ حقیقت کی سفاک چہرہ دستی۔ میرا جنون تمھیں اپنانا چاہتا تھا۔ تمھاری کوئی کمی مجھ میں اپنا آپ تلاش کر رہی تھی — تم میری اک خود مستی ہو، میں ہوں تمھاری خود بینی — نتیجہ؟ قصے میں اس عشق کے ہم تم، دونوں بے بنیاد ہوئے! اللہ اکبر:

شوق کا رنگ بجھ گیا، یاد کے زخم بھر گئے

کیا مری فصل ہو چکی، کیا مرے دن گزر گئے

یہ بحر جون صاحب کی مرغوب ترین بحر ہے اور اردو اور فارسی ملا کر بھی دیکھیں تو اس بحر میں اتنی غزلیں کسی نے نہیں کہیں، جتنی جون صاحب نے کہی ہیں۔ اور اس بحر میں ان کا تخلیقی وفور اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اب ذرا شعر کی نازکی پر غور کیجیے:

شوق کا رنگ بجھ گیا؟ یاد کے زخم بھر گئے؟

کیا میری فصل ہو چکی؟ کیا مرے دن گزر گئے؟

یہ کسی اور سے سوال ہے یا خود کلامی؟ اتنا دھیما لہجہ اور ایسا کاٹ دار؟ نازک ہے بہت کام صاحب — سینہ کوبی کیجیے یا سر دیوار سے دے ماریے۔ اس سے کم داد کا مستحق یہ شعر نہیں:

شام ہے کتنی بے تپاک، شہر ہے کتنا سہم ناک

ہم نفسو، کہاں ہو تم، جانے یہ سب کدھر گئے؟

کون ہیں جو کہتے ہیں کہ جون ایلیا سہلِ ممتنع کا شاعر ہے۔ جناب شام کی

بے تپاکی۔ شہر کی سہم ناکی — یہ اتنی پیچ دار صورتِ حال ہے کہ جدید حسیت کے تمام دعوے دار اپنی دکانیں بڑھا کر جون ایلیا کے حجرے کی دربانی کریں تو انھیں معلوم ہو کہ جدید حسیت کسے کہتے ہیں۔ سہلِ ممتنع تک جون صاحب کو محدود سمجھنے والوں کے لیے چند اور اشعار:

خیرہ سرانِ شوق کا، کوئی نہیں ہے جنبہ دار
شہر میں اس گروہ نے کس کو خفا نہیں کیا؟
جس کو بھی شیخ و شاہ نے، حکمِ خدا دیا قرار
ہم نے نہیں کیا وہ کام، ہاں بخدا نہیں کیا

تُو کبھی سوچنا بھی مت، تُو نے گنوا دیا مجھے
مجھ کو مرے خیال کی موج بہا کے لے گئی

بند رہے جن کا دروازہ ایسے گھروں کی مت پوچھو
دیواریں گر جاتی ہوں گی آنگن رہ جاتے ہوں گے
میرا سانس اکھڑتے ہی سب، بین کریں گے روئیں گے
یعنی میرے بعد بھی یعنی، سانس لیے جاتے ہوں گے؟

ہم نے خدا کا رد لکھا، نفی بہ نفی لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے
میں تو صفوں کے درمیاں کب سے پڑا ہوں نیم جاں
میرے تمام جاں نثار، میرے لیے تو مر گئے

عجب ہے ایک حالت سی ہوا میں
ہمیں جیسے گنوایا جا رہا ہے!

ایسے کتنے ہی اشعار ہیں جن کے موضوعات بھی بہت گہرے اور گنجلک ہیں اور جن میں جون صاحب کی قدرتِ کلام اس اوج کمال پر ہے کہ اس پر گفتگو ایک مکمل کتاب کا موضوع ہے۔

اس بار وہ تلخی ہے کہ روٹھے بھی نہیں ہم
اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے

ایسی تلخی کہ روٹھنا اور جھگڑنا ایک تعلق کی تجدید لگے، یہ بالکل جدید طرزِ احساس بھی ہے اور طرزِ اظہار بھی۔ یہ اتنی افراط اور کاملیت کے ساتھ صرف جون ایلیا کے یہاں پایا جاتا ہے:

جانے تری نہیں کے ساتھ، کتنے ہی جبر تھے کہ تھے
میں نے ترے لحاظ میں، تیرا کہا نہیں کیا

کون ہوگا جو اس شعر سے سرسری گزر جاتا ہوگا؟ کیا اسے یہ احساس ہے کہ کتنا بڑا شعر اس نے سرسری گزار دیا؟ میں نے ترے لحاظ میں تیرا کہا نہیں کیا؟ سبحان اللہ:

کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں

بے دلی کی کیفیت کا ایسا نادر بیان مجھے پوری اردو شاعری میں دکھا دیجیے تو میں اپنے اس دعویٰ سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں کہ جون ایلیا ایک بہت اچھا نہیں، بہت بڑا شاعر ہے:

دل کو تری ہوس سے کسی دم نہیں قرار
ہلکان ہوگیا ہوں تری دل کشی سے میں

ایک لفظ سے کیفیت کو شدید ترین احساس بنا دینا اور ایسا احساس جس کی شدت پڑھنے والے کو پوری پوری محسوس ہو، کوئی معمولی بات نہیں۔ ہلکان کا ایسا برتاؤ کہ اس کی جگہ کوئی لفظ نہ لے سکے، مجھے تو کہیں نہیں ملا۔ ذرا دل کشی سے ہلکان ہونے کا تصور تو اپنے حواس پر طاری کیجیے۔ اور اگر وجد میں آئیے تو جون ایلیا کو یاد کیجیے:

یہ حشرِ ناز کہ بس، اور یہ تیز تیز نفس
تمھیں سلیقۂ انکار تک نہیں آتا

کیسی منظر کشی ہے۔ ایک قتّالہ سامنے صاف دکھائی پڑتی ہے، اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں کے ساتھ۔ اور اس پر یہ شدید مصرع کہ — تمھیں سلیقۂ انکار تک نہیں آتا — یہ شاعری ہے صاحب۔ خالص شاعری۔

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

سہلِ ممتنع؟ چھوٹے سے دائرے کا شاعر۔ یہ چھوٹا سا دائرہ ہے تو بڑا کیا ہوتا ہوگا؟ انسان کی نفسیاتی پیچیدگی کا ایسا اظہار اس قابل ہے، اس شعر کے خالق پر یونی ورسٹیوں میں مقالہ در مقالہ کام کیا جا رہا ہو۔ کہاں ہو رہا ہے وہ کام؟ کون لکھ رہا ہے جون ایلیا پر؟ آج ان کے انتقال کو کئی برس گزرنے کے بعد بھی کوئی ایک قابلِ ذکر مضمون کہیں شائع ہوا ہو تو میرے علم میں نہیں ہے:

بولتے ہی سے ہیں جو رشتے ہیں
تُو عجب ہے کہ بولتا ہی نہیں

عمرانیات کے ماہرین کو ایسا شعر ہاتھ لگ جائے تو جون کی دست بوسی کریں۔ مگر پڑھے تو کوئی ذہن کھول کر پہلے اس شاعر کو:

عجیب ہے مری فطرت کہ آج ہی مثلاً
مجھے سکون ملا ہے ترے نہ آنے سے

کیا کسی شاعر نے آج تک انسانی فطرت کی اس نفسیاتی پیچیدگی پر شعر کہا ہے؟ یہ ایک بالکل نیا شعری رویہ ہے جس کا آغاز بھی جون صاحب نے کیا اور اسے ایسے کمال پر پہنچا دیا کہ اب ان کی تقلید کرنا شاید ہی کسی کے لیے ممکن ہو سکے:

اُس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

کسی غیر انسانی وجود کو احساس بخش دینا جون ایلیا کا کمال ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا تھا کہ آپ ایک گلی کے غم کو اپنی روح کی گہرائی میں محسوس کر سکتے ہیں؟ کیسے ایک گلی ایک پوری انسانی برادری کا استعارہ بن گئی ہے؟ مذاق نہ باشد:

جانا نہیں ہے گھر سے نکل کر کہیں، مگر
ہر ماہ رُو کے گھر کا پتا چاہیے ہمیں

کیسی سچی کیفیت ہے۔ کتنی بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم اس بات سے قطعِ نظر کہ ہمیں اس معلومات کی ضرورت ہے یا نہیں، کسی کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ کتنے اشعار اس موضوع پر اردو شاعری میں ملیں گے آپ کو؟ جون چھوٹے دائرے کا شاعر نہیں۔ جون ایک آفاقی شاعر ہے جس کا دائرہ پوری انسانی حسیات پر محیط ہے:

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں
جو بھی خوش ہے، ہم اُس سے جلتے ہیں

ایسا سچا اور کھرا شاعر کوئی دوسرا نہ ہوا ہوگا۔ کس میں اتنی ہمت ہوگی جو یہ کہہ سکے؟ مگر کوئی ہے جو اس بات سے انکار کرے؟ حسد کا جذبہ جس شدت سے انسانی نفسیات میں گہرا اترا ہوا ہے شاید اتنا کوئی اور جذبہ نہیں، خواہ ہم اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔ جون نے اعتراف بھی کیا اور ہمیں آئینہ بھی دکھا دیا۔ اسی طرح کی سچائی پر مبنی ایک اور شعر دیکھیے:

ہاں ٹھیک ہے، میں اپنی انا کا مریض ہوں
آخر مرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی؟

بڑے بڑے انا گیر ہیں جو انکسار کا ڈھونگ رچاتے نہیں تھکتے، اور یہاں یہ شخص ہے جو کھل کر ایک ایسی انسانی کمزوری کا اعتراف کر رہا ہے، جو بیشتر انسانوں میں ہوتی ہے، مگر جسے قبول کرنے کی ہمت ان میں نہیں ہوتی:

اک شخص کر رہا ہے ابھی تک وفا کا ذکر
کاش اس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی

لاہور میں ایک بہت جید شاعر نے اس شعر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "بتایئے صاحب۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ شاعر تو وفا کا پرچار کرتا ہے۔ یہ کیسا شاعر ہے جو وفا کا ذکر کرنے والے کا منہ نوچ لینا چاہتا ہے؟" میرا جی چاہا کہ یا تو ان حضرت کا منہ نوچ لوں یا اپنے بال نوچ ڈالوں۔ وفا کی گھٹتی ہوئی قدر اور انسان کی اس بنیادی صفت کے ختم ہونے کا کرب ایسے طنزیہ انداز میں ایک باکمال شاعر کے ایک شان دار شعر کی صورت میں منتج ہوا، جس کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی بہت سے لوگ محروم ہیں۔ محسوس کرنا اور اس کرب میں شریک ہونا تو دور کی بات ہے:

ہم موجۂ شمیم کی صورت برہنہ ہیں
تُو رنگ بن کے آ کہ ردا چاہیے ہمیں

غالبؔ نے کہا تھا کہ — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا — کتنے قاری ہیں جنھیں یہ بات سمجھ آئی کہ جون ایلیا نے اس خیال کو ایسے personalize کر دیا ہے کہ مرزا نوشہ سنتے تو جون میاں کا ماتھا چوم لیتے:

نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو، وہاں اکثر نہ رہیو

Monotony کی صورتِ حال پر ایسا بڑا شعر اگر آپ نے کہیں پڑھا ہو تو میں سننا چاہوں گا۔ اس شعر کا تو پہلا مصرع ہی اتنا بڑا ہے کہ صرف اس پر ایک فلسفیانہ مقالہ تحریر کیا جاسکتا ہے:

شکستِ اعتمادِ ذات کے وقت
قیامت آرہی تھی، آگئی کیا؟

اپنی ذات پر اعتماد ہی ہے جو جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ دنیا کو جھیلنے کی سکت دیتا ہے۔ جب یہ اعتماد ٹوٹتا ہے تو یہی گمان گزرتا ہے کہ وجود کا اب کوئی جواز نہیں۔ قیامت کا کوئی اور نہیں یہی دن ہے۔ اور پھر یہ سوال — قیامت آرہی تھی، آگئی کیا؟ کیا کہیے اس باب میں مزید۔

اس کی امیدِ ناز کا، ہم سے یہ مان تھا کہ آپ
عمر گزار دیجیے، عمر گزار دی گئی

میرے نزدیک یہ جون ایلیا کے بہترین اشعار میں سے ایک ہے۔ شدتِ احساس کی ترسیل کی ایسی اعلیٰ مثال بہت کم پڑھنے میں آتی ہے۔ کسی بھی شاعر کے لیے یہ سب سے مشکل کام ہوتا ہے کہ قاری تک اس احساس کو اسی شدت کے ساتھ منتقل کردے جو اس خاص کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ جون صاحب یہ کام ایسی سہولت سے کر جاتے ہیں کہ انھیں اس کی داد تک نہیں ملتی:

ہم کہ اے دل سخن سراپا تھے
ہم لبوں پر نہیں رہے آباد

کیسا بڑا المیہ ہے آج کے انسان کا۔ کیبل ٹی وی، سیل فون اور انٹرنیٹ پر مصروف انسان کا المیہ۔ بولنے ہی سے تھے جو رشتے تھے۔ آج کا انسان کیا عجب ہے کہ بولتا ہی نہیں۔ لبوں پر آباد رہنے والے سخن سراپے آج خاموش ہیں۔ تبھی تو ایسی ویرانی ہے

دنیا میں ہر طرف۔ مگر جون یہیں پر بس نہیں کر جاتا— وہ اس المیے سے اتنا متاثر ہے کہ اس کا ذہن فوراً یہ سوال اٹھاتا ہے کہ:

جانے کیا واقعہ ہوا، کیوں لوگ
اپنے اندر نہیں رہے آباد

جدید حسیت اگر یہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اب پوچھے کوئی ان جدید نقادوں سے جو جدید حسیت کا راگ الاپتے ہیں مگر ان کی گفتگو میں کہیں جون ایلیا کا ذکر نہیں آتا۔ جدید عہد کا اس سے زیادہ الم ناک واقعہ کوئی نہیں کہ لوگ اپنے اندر آباد نہیں رہے۔ آج ہم اپنے اطراف میں پھیلی ہوئی اشیا کے حوالے سے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ انسان کے اندرون کی موت ہے۔ گویا انسان کی موت۔ ایک غیر انسانی طرز احساس کا مظہر۔ کسی اور مخلوق کی سمت Devolution کی بنیاد۔

بہت بے آسرا پن ہے، سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ، خدا نئیں

جب مایوسی حد سے بڑھتی ہے، جب ایک حساس شاعر اپنے اطراف پھیلتی ہوئی بیگانگی، بھوک، افلاس، ناانصافی دیکھتا ہے تو کسی بھی سوچنے والے ذہن کی طرح خدا کے وجود پر سوال اٹھاتا ہے، مگر ایک ایسے لہجے میں کہ دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ جیسے کسی فلسفی کا قول شعر میں ڈھلتا ہے— بہت بے آسرا پن ہے، سو چپ رہ۔ نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا نئیں!

تو ہے پہلو میں، پھر تری خوشبو
ہو کے باسی کہاں سے آتی ہے

یہ شعر کسی بے وفا محبوبہ کے جسم سے آنے والی مہک کا بیان نہیں۔ یہ ایک بجھے ہوئے انسانی تعلق کا نوحہ ہے۔ اس سے زیادہ تشریح کرنے کی بجائے صرف اتنا کہوں گا

کہ جون ایلیا ایک ایسا شاعر ہے جسے بڑی بات کو بالکل سامنے کی بات بنا دینا آتا ہے، اور اس خوبی کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا دھوکا کھا جاتا ہے۔ سپردگی جب کامل سپردگی نہیں رہتی تو پھر تری خوشبو— ہو کے باسی کہاں سے آتی ہے— اور آج کے اس دور میں کامل سپردگی ہم بٹے ہوئے انسانوں کے نصیب میں بھلا کہاں؟

خوش ہو سینے کی ان خراشوں پر
پھر تنفس کے یہ صلے بھی کہاں

ایک ایسا انسان جس کے پھیپھڑے چالیس سالہ پرانی ٹی بی اور اس پر دی گئی برسوں پر محیط سگریٹوں کی دھونی نے چھلنی کر رکھے ہوں، اس کا اس تکلیف کو ایسا شعر بنا دینا کوئی معمولی بات ہے؟

کیوں ہمیں کر دیا گیا مجبور
خود ہی بے اختیار تھے ہم تو

جبر و اختیار پر کیا کیا مباحث قدما، متوسطین سے لے کر آج تک جاری ہیں۔ ایسی فلسفیانہ بحث کو کس سہولت سے دو مصرعوں میں سمیٹ دیا ہے جون ایلیا نے۔ یہ شعر محض ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ جون صاحب کے یہاں اس طرح کے فلسفیانہ موضوعات پر بے شمار اشعار ملتے ہیں:

اب جو رشتوں میں بندھا ہوں تو کھلا ہے مجھ پر
کب پرند اُڑ نہیں پاتے ہیں پروں کے ہوتے

ذمے داریوں میں بندھا ہوا انسان کتنی ہی بار اس احساس کو اپنے اندر موجزن پاتا ہے، مگر کون شاعر ہے جو اس احساس کو یوں زبان عطا کرنے پر قادر ہے— جون ایلیا۔

ہم نے جانا تو ہم نے یہ جانا
جو نہیں ہے وہ خوب صورت ہے

انسانی نفسیات کی ایک ازلی اور ابدی کم زوری کو کس خوب صورتی سے شعر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ فلسفہ اور ہوتا کیا ہے؟ بڑی حقیقتوں کا ادراک اور ان کی توجیہہ۔ شاعر کا کام بات سمجھانا نہیں ہوتا۔ بات پہنچانا ہوتا ہے۔ اور بات بھی کیا۔ اس بات سے متعلق کیفیت۔ کیفیت کی ترسیل ہی شاعری ہے:

خواہشیں دل کا ساتھ چھوڑ گئیں
یہ اذیت بڑی اذیت ہے

ایک طرف ایسا براہِ راست اظہار اور دوسری طرف یہ شعر —

وہ جو تعمیر ہونے والی تھی
لگ گئی آگ اُس عمارت میں

ایک انسان اپنے شب و روز میں جن نازک کیفیات سے دوچار رہتا ہے، ان کیفیات کا اردو شاعری کی معلوم تاریخ میں اتنا شاعرانہ اظہار مجموعی طور پر بھی کم ہی ملتا ہے، کسی ایک شاعر کے یہاں تو ماسوائے جون ایلیا کی ان کی تلاش فضول ہے:

زندگی کی غزل تمام ہوئی
قافیہ رہ گیا محبت کا

ایک تمام زندگی کی محرومی اس ایک شعر میں موجود ہے۔ مگر یہ محرومی شاعر کو توڑتی نہیں۔ اس کے احساس کو مہمیز دیتی ہے۔ اور وہ اس تجربے سے گزر کر یہ کہتا ہے کہ:

ترکِ الفت ہے کس قدر آسان
آج تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں

اس شعر کو آپ پر کھولنے کے لیے میں جون صاحب کا ایک اور شعر پڑھتا چلوں کہ:

آج کے بعد عشرتِ مجلسِ شامِ غم کہاں
دل نہ لگے گا تیرے بعد، پر ترے بعد ہم کہاں؟

جب میں ہی نہ رہا تو مجھ سے متعلق کسی چیز کا ہونا یا نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

پس — آج تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

جمالیات کا اظہار اردو شاعری میں بہت ہوا ہے، مگر شیروانی پہنے ہوئے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ایک عاشق کی شدت، معصومیت، والہانہ پن، ہوس، خواہش، محبت، سب کا ویسا اظہار ہوتا نظر آئے جیسا کہ فطری تقاضا ہے۔ جون صاحب اردو شاعری میں اس کمی کو بھی پورا کیے دیتے ہیں:

یارو کچھ تو بات بتاؤ، اُس کی قیامت بانہوں کی
وہ جو سمٹتے ہوں گے اُن میں، وہ تو مر جاتے ہوں گے؟

کوئی جواب ہے ان دو مصرعوں کا اور کیا ایسی ہی کیفیت اُس عاشق کی نہ ہوگی جس کا محبوب اس کی دسترس سے باہر ہو اور اس کی خواہش اپنے عروج پر ہو؟ یہ سچی شاعری ہے۔ سچی کیفیات کا کھرا اظہار ہے:

ہے نسیم بہار گرد آلود
خاک اڑتی ہے اُس مکان میں کیا؟

ہجرت کا ایسا نوحہ کس نے لکھا ہوگا؟ ہجرت کی کسک ہو یا فراق کی بے چینی، وصال کی آسودگی ہو یا نامعلوم کی حیرت، خدا کی تلاش ہو یا تقدیر کا جبر، اختیار کا عیش ہو یا ہونے کی صعوبت — جون ایلیا کے یہاں سب کچھ ہے:

ابھی اک شور ہاؤ ہو سنا ہے ساربانوں نے
وہ پاگل قافلے کی ضد میں پیچھے رہ گیا ہوگا

بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جون ایلیا تنہائی پسند، بلکہ مردم بیزار تھے۔ ایسا بالکل نہیں۔ اپنی شاعری میں بھی واحد متکلم سے بہت کام لینے کے باوجود ایک تہذیبی اثاث کے اجر انسانیت کی یک جائی کے شاعر ہیں:

ہے بکھرنے کو یہ محفلِ رنگ و بُو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے
ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفتگو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

وہ خواب دیکھتے ہیں تو ساری انسانیت کے لیے دیکھتے ہیں۔ ایک نئی دنیا کا نقشہ ابھارتے ہیں تو وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے ہوتا ہے۔ ذاتی رنج کو اجتماعی احساس بنا دینا ایک بہت عظیم بات ہے اور جون صاحب اس کے بادشاہ ہیں:

جو ان روزوں مرا غم ہے وہ یہ ہے
غموں سے بردباری جا رہی ہے

جون ایلیا کی شاعری ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ ایک ایسی تہذیب جس میں رکھ رکھاؤ تھا، محبت تھی، سخن تھا، تعلق تھا، محبت تھی، بردباری تھی، برداشت تھی، انسانیت تھی۔ وہ جدید دور کے انسان کی ایک بات سے بہت چڑتے تھے۔ دوغلا پن۔ دوسروں کو اس بات کی تلقین کرنا جو آپ خود نہ کرتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے جون صاحب سخت چڑ جاتے تھے۔

جو بھی ہو تم پہ معترض، اُس کو یہی جواب دو
آپ بہت شریف ہیں، آپ نے کیا نہیں کیا؟

وہ ایک ایسی تہذیب کے نمائندہ تھے جو بہت پرانی ہونے کے باوجود آج کی تہذیب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ زیادہ انسان دوست تھی۔

ایسے شاعر پر بات کرتے ہوئے اس تہذیب کا پاس بھی ضروری ہے اور ادب کی بنیادی اقدار سے محبت بھی۔

تمام گفتگو جون صاحب کی غزل کے اشعار تک محدود رہ گئی جب کہ جون صاحب نظم کے بھی بہت بڑے شاعر ہیں۔ تفصیل کسی اور وقت، مگر سرِ دست اتنا کہ جون ایلیا کی نظم ''درخت زرد'' اردو شاعری کی تاریخ کی چند بڑی نظموں میں سے ایک ہے۔

اتنی بڑی کہ اگر آپ جون ایلیا کی غزلوں کو ایک طرف رکھ دیں تو یہ اکیلی نظم انھیں ہمیشہ ایک بڑے شاعر کے طور پر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

آپ کو ایسے شاعر ملیں گے جن کے مضامین جون کی شاعری میں موجود مضامین کی طرح بڑے ہیں۔ ایسے شاعر بھی ملیں گے جن کی فنی مہارت اور چابک دستی بھی جون ایلیا کے پائے کی ہو۔ وہ شاعر بھی موجود ہیں جن کا ذخیرۂ الفاظ اور الفاظ کو برتنے کا سلیقہ جون ایلیا سے کسی طرح کم نہیں۔ اور ایسے شاعر بھی کچھ ہیں جن کے اشعار میں شعریت ویسے ہی موج زن ہے جیسے جون ایلیا کی شاعری میں۔ مگر ایک خوبی ہے جو صرف جون ایلیا کے پاس ہے — بے ساختہ، براہِ راست دل میں کُھب جانے والا لہجہ۔ ایسا لہجہ جو جون ایلیا کی شناخت بھی ہے، انفرادیت بھی۔ اور ان کی آئندہ دور میں زندہ رہنے والی شاعری کا جواز بھی۔

اردو شاعری کا ایک بڑا المیہ ہے۔ اور وہ المیہ یہ ہے کہ غزل کی روایت میں کئی دہائیوں تک ایک جیسے مضامین اور طرزِ اظہار نے شاعروں کو اپنا احوال لکھنے کے بجائے گل و بلبل کی حکایات رقم کرنے پر لگائے رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں احساس کا اظہار زندگی میں احساس اور بدلتے رویوں سے کٹ کر رہ گیا۔ ان پر ستم یہ کہ جدید حسیت کے نام پر اردو شاعری میں انگریزی الفاظ کا ٹانکنا، عام بول چال کو رائج کرنا، اور مروّجہ اصولوں سے روگردانی کو عہدِ جدید کی نمائندہ شاعری کہہ دیا گیا۔ جدید شاعری وہ ہے جو ایک جدید انسان کے احساس اور کیفیات کی ترجمانی کرے۔ انسان جدید اشیا سے نہیں ہوتا کہ بلب، ٹرک، اور کار لکھ کر آپ اس کی ترجمانی کر دیں۔ انسان جدید احساس کی سطح پر ہوتا ہے۔ جون ایلیا ان پانچوں شعرا میں سے، جن کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا، جدید طرزِ احساس اور اظہار کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔

وہ بات رہ گئی کہ جون صاحب بڑے شاعر ہیں یا نہیں۔ مگر ان کے اشعار سنانا

ان کی خوشی کے لیے زیادہ اہم تھا۔ جہاں تک جون ایلیا کے بڑے شاعر ہونے کا سوال ہے تو جون ایلیا کی شاعری میں زبان کی درستی، لفظوں کو ان کے پورے امکانات کے ساتھ برتنے کا سلیقہ، اور تراکیب اور ردیفیں اخذ کرنے کا جو کمال موجود ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی بات کیجیے تو شاید جوش صاحب اور رئیس امروہوی کے علاوہ کوئی اور شاعر ان کی برابری نہ کر سکے۔ مضامین کا جیسا تنوع ان کے یہاں ملتا ہے، وہ کسی معمولی ذہن کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مصرع سازی اور کیفیت کے اظہار کا جو سلیقہ جون صاحب دکھا گئے ہیں، آنے والا دور اس کے سبب ان پر ناز کرے گا۔ اور شعریت تو گویا جون صاحب پر ختم ہے۔ جب شعریت، کیفیت اور احساس کی ترسیل کی بات آئے تو بس پھر ایک میر جون اور ایک میر تقی—

شاعر تو دو ہیں، میر تقی اور میر جون
باقی جو ہیں، وہ شام و سحر خیریت سے ہیں

اس شعر کو اس کے لغوی معنی میں بے شک نہ لیجیے، مگر جون ایلیا کو محض ایک اچھا یا بہت اچھا شاعر کہہ کر مت گزر جائیے۔ جون ایلیا ایک بڑا شاعر ہے۔ اس پر بات کیجیے، تنقید کیجیے، عیب گنوائیے، میری باتوں کو رد کیجیے۔ مگر خاموش نہ رہیے:

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا، اور ملال بھی نہیں!

○

جون ایلیا — صاحبِ اسلوب شاعر

انسانی ذہن کی بوالعجبی کا کیا کہنا۔ گزشتہ دنوں جب مجھے جون ایلیا کے بارے میں مضمون لکھنے کا حکم دیا گیا تو ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرا ذہن مصطفیٰ زیدی کے ایک جملے کی طرف منتقل ہو گیا۔

ایک مضمون میں زیدی نے جوشؔ کی ایک رباعی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

تارا ہوں جو ٹوٹا بھی تو گوہر ہوں گا
قلزم ہوں جو سمٹا تو سمندر ہوں گا
اس عرشِ تخیل کی بلندی سے کبھی
بالفرض گرا بھی تو پیمبر ہوں گا

کہ بالفرض کو شعر میں اس طرح برتنے کے لیے شاعر کو سیروں خون تھوکنا پڑتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت جون ایلیا پر قلم اٹھاتے وقت ہوئی کہ اس نابغۂ روزگار ذہن اور انوکھے قلم کی کس کس صفت کا ذکر کیا جائے اور کیوں کر کیا جائے۔ مروجہ اصطلاحات کی تہی دامانی کہ کون سی اصطلاح اس نیم کش تخیل اور اس انوکھے اسلوب کا احصا کر سکتی ہے۔ اس انوکھے طرزِ اظہار کو جون ایلیا کا عالمِ محسوسات چاہیے جس کی زرخیز کشت میں

تمام قدیم علوم وفنون کی توانائی اور فلسفے کی گہرائی اور گیرائی نمو پذیر ہیں۔ جہاں بابل اور نینوا کی تہذیبی اور عربی، فارسی اور اردو کی کلاسیکی روایات ایک مستقل حوالہ ہیں۔

تیکھے اور بانکے لہجے کا یہ طرزِ نگارش لفظیات کی کٹیلی نشست میں شاعر کے نام کی طرح انوکھا ہے۔ جون کا جتنا سرمایۂ کلام منظرِ عام پر آچکا ہے، اس میں مضامین کی رنگا رنگ تزئین کے باوجود جو کڑی سب کو ایک اچھوتے تاثر میں پروتی ہے، وہ بھی طرزِ نگارش ہے۔

روایتی غزل تذکرۂ من و تو سے عبارت مگر جون ایلیا کے ہاں وہ روایتی تہذیب تعلق نظر نہیں آتا جو غزل کا خاصہ ہے۔ یہاں مر مٹنے سے زیادہ محبوب کو آئینہ دکھانے کا عنصر ہے۔ یہاں انسانی انا اور پندار کا بھرم عشق میں جاں نثار کرنے سے زیادہ محبوب اور مقصود نظر آتا ہے۔ اس کیفیت کو تبصرے سے بہتر طور پر کچھ شعروں کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے:

کیا کہا عشق جاودانی ہے
آخری بار مل رہی ہو کیا

مل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ
مجھ کو یکسر بھلا چکی ہو کیا

شدتِ جذبات کا یہ پیرایۂ اظہار کتنا چونکا دینے والا ہے:

تم کو کسی کے سایۂ پرتو سے کیا غرض
تم اپنے حق میں بیچ کی دیوار ہی رہو

تم خون تھوکتی ہو، یہ سن کر خوشی ہوئی
اس رنگ، اس ادا میں بھی پُرکار ہی رہو

شعرائے اُردو میں اس طمطراق کا لہجہ نادر و نایاب ہے۔ یہ سب کچھ کہہ کر کچھ

نہ کہنے کی ادا ملاحظہ فرمائیے:

غصہ بھی ہے تہذیبِ تعلق کا طلب گار
ہم چپ ہیں بھرے بیٹھے ہیں غصہ نہ کریں گے
اس بار وہ تلخی ہے کہ روٹھے بھی نہیں ہم
اب کے وہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے

غزل اپنی نیم نگاہی میں بے شک طاق سہی مگر تخیل کی اس کج کلہی کا مظاہرہ کم کم ہی نظر آتا ہے۔ جون ایلیا اپنے تخیل میں غالبؔ کی سی کاٹ رکھتے ہیں اور طرزِ اسلوب میں میر تقی میرؔ اور غالبؔ دونوں کے وارث نظر آتے ہیں۔ کمالِ فن یہ ہے کہ اس میں بھی شاعر کی انفرادیت اور تراکیبِ شعری میں تنوع برقرار ہے۔ ایک رنگ یہ ہے:

جان ہے وہ ہر ایک محفل کی
ہم بھی اب گھر سے کم نکلتے ہیں

تو دوسرا اس سے یکسر مختلف:—

کوچۂ کج کلہاں تیرے وہ ہجرت زدگاں
خود سری بھول گئے، خود نگری بھول گئے
کیا کہیں کتنی ہی باتیں ہیں جو اب یاد نہیں
کیا کریں ہم سے بڑی بھول ہوئی بھول گئے

غالبؔ کے تخیل کی کاٹ اور اسلوب کی چستی ملاحظہ کرنی ہو تو اَن گنت اشعار پڑے جمائے نظر آتے ہیں:

خوباں کہاں تھے نکتۂ خوبی سے باخبر
یہ اہلِ فن کی بات تھی اور اہلِ فن میں تھی
میں اور پاسِ وضعِ خرد، کیا ہوا مجھے
میری تو آن ہی مرے دیوانہ پن میں تھی

جرأتِ انکار کی عظمت کا جرأت مندانہ اظہار کتنا سحر انگیز ہے۔ درج ذیل شعر ملاحظہ ہو:

انکار ہے تو جرأتِ انکار کچھ بھی ہو
یزداں سے پوچھنا یہ ادا اہرمن میں تھی

جون ایلیا کا فلسفیانہ رنگِ تغزل بھی بڑے خاصے کی چیز ہے۔ ان کی انتہائی توانا شاعری اور منفرد طرزِ فکر کائنات کے ہنوز ناآشنائے جواب سوالات کے ذیل میں اپنی جولانیٔ طبع اور فکرِ رسا کے بل بوتے پر انتہائی دل نشیں بلکہ جوش صاحب کے الفاظ میں ''سرنشیں'' ریختہ تخلیق کر گئی ہے۔ یہ مضامین ایسے ہیں کہ جن کی تضمین کرنے میں بڑے بڑے شعرا کا لہجہ بھی خشک ہو جاتا ہے اور طرزِ نگارش بے رنگ نظر آنے لگتی ہے مگر جب جون ایلیا کا قلم جنبش کرتا ہے تو تاریخی شہ پارے وجود میں آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

ہم نے خدا کا رد لکھا نفی بہ نفی، لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

یا پھر اسی فکر کا antithesis کس بے بسی کا تاثر کس طرح میرؔ کے سے سہلِ ممتنع سے شعر میں ڈھالتا ہے:

بڑا بے آسرا پن ہے سو چپ رہ
نہیں ہے یہ کوئی مژدہ خدا میں

اس جہانِ خراب کی خرابی کی فلسفیانہ توجیہ جونِ ایلیا کی طبعِ رسا نے نہایت اچھوتے طرز سے کی:

حاصلِ کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

یہ فلسفیانہ رنگِ تغزل جب زمینی حقیقتوں کا ادراک کرتا ہے اور اپنے گرد و پیش کے تضادات کو محسوس کرتا ہے تو اپنے فطری بانکپن سے نادر تراکیب وضع کرتا نظر آتا

ہے۔ اور اس بانکپن میں شوخ طرزِ اظہار دو آتشہ کا لطف پیدا کر دیتا ہے۔

ایک غزل کے دو شعر پیشِ خدمت ہیں:

نسبتِ علم ہے بہت حاکمِ وقت کو عزیز
اس نے تو کارِ جہل بھی بے علما نہیں کیا

جس کو بھی شیخ و شاہ نے حکمِ خدا دیا قرار
ہم نے نہیں کیا وہ کام، ہاں بخدا نہیں کیا

جون ایلیا کی طبعِ رسا، ان کے ذخیرۂ الفاظ پر صیقل کرتی، ان کی ذہنی اُپج اور ان کی برصغیر کی کلاسیکی روایات سے اٹوٹ وابستگی ان کو اردو شعرا کی اس صف میں ایک نمایاں مقام اور منصب کا اہل بناتی ہے جن کو مشرق کی بلند نظری کا مکمل عرفان تھا۔ اس کے دوش بدوش وہ عہدِ حاضر کے آزاد ذہنی رویوں سے بھی بخوبی آشنا تھے۔

جس طرح مصطفیٰ زیدی کی شاعری مشرقی اور مغربی ادب اور فلسفے کا حسین امتزاج ہے، اسی طرح جون ایلیا کی شاعری میں جو عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ ان کی پہچان بن جاتا ہے، وہ یہی انجذاب اور اظہار کا عمل ہے۔ وہ اپنے ٹھوس کلاسیکی ورثے کو عہدِ حاضر کے آزاد اور غیر متاثر ذہن کی ٹکسال پر کسنے کے بعد اپنی بے مثال قوتِ اظہار سے شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ یوں انھیں حیاتِ نو کی نوید ملتی ہے۔

درج ذیل شعر کا مضمون بظاہر متضاد نظر آتا ہے مگر کس ماہرانہ انداز سے جون ایلیا اس خیال کو فکر کی اکائی میں ڈھالتے ہیں:

خدا نہیں ہے تو کیا حق کو چھوڑ دیں اے شیخ
غضب خدا کا، ہم اپنے امام کے نہ رہیں

یہ اسی فکرِ رسا کی دین ہے کہ تاریخِ انسانی کے اس عظیم ترین واقعے کا حوالہ عین غزل میں بھی آجائے تو ان کا قلم کیسی معجزانہ نگارش تخلیق کرتا ہے۔ میری مراد امام حسین کی شہادتِ عظمیٰ اور ان کی شخصیت سے ہے۔ یہ مقصدِ شہادت آج کے ذہن کو عین

relevent نظر آتا ہے۔

دو اشعار پیشِ خدمت ہیں:

ہو جنگ جیتنی تو بہر بھی ہے قیمتی
تاریخ جیتنی ہو تو اصغر بھی کچھ نہیں

اب اے حسین بات زمانے کی مان لو
کیا یہ شگافِ سینۂ اکبر بھی کچھ نہیں

یہ محض اس پیغام کے حقیقی عرفان اور لفظیات پر معجزانہ گرفت کا سحر ہے، ورنہ اس متن میں ''کچھ نہیں'' کا ردیف باندھنے کے لیے بقول مصطفیٰ زیدی کے شاعر کو سیروں خون تھوکنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوائلِ مضمون میں عرض کیا ہے۔

دامنِ اردو کو ایسے ایسے گہر پاروں سے مالامال کرنے کے بعد بھی جون ایلیا نے لکھا کہ میں ''رائگاں گیا۔'' یہ رائگاں جانے کا احساس اپنے اطراف کی جہات کی ذہنی تنگ نظری میں رہنے کا احساس ہے۔ یہ تہی دامانی اور ناکامی جون ایلیا کی ناکامی نہیں ہے۔ یہ ایک شاعرانہ شکوہ ہے، اپنے اطراف و اکناف سے کہ وہ اپنے اوّلین مجموعۂ کلام کو اپنے اعترافِ شکست کا نام دیتے ہیں۔ مجھے اس کی توجیہہ جون ایلیا کے اسی مضمون میں مل جاتی ہے۔ یہ ایک مثالیہ پرست تخلیق کار کی ناآسودگی ہے جس کو یہ باور کرایا گیا کہ ''علم سب سے بڑی فضیلت ہے اور کتابیں سب سے بڑی دولت، تو وہ رائگاں نہ جاتا تو اور کیا ہوتا۔''

اس تنگ میں بھی جون ایلیا پکارتے رہے:

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

○

جون ایلیا اور زندگی کی معنویت

کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کرے
اور ثابت کرے کہ میرا وجود—
زندگی کے لیے ضروری ہے

(بے ثبات)

یہ جون ایلیا کی ایک نظم کے چند مصرعے ہیں— لیکن جب ہم اُن کی شاعری کا عمیق اور تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی شاعرانہ فکر کا بنیادی مسئلہ اور طرزِ احساس کا اساسی نکتہ ان مصرعوں میں پوری جامعیت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ دراصل جون ایلیا کی شاعری انسانی وجود کی بے معنویت کے شعور سے جنم لیتی ہے۔ انسانی وجود سے متعلق سوالات اور اس کے اثبات کی خواہش ہمیشہ سے فلسفہ و ادب میں موجود رہے ہیں، تاہم روایتی فلسفے میں جوہر کو اوّلیت حاصل تھی جب کہ وجودی مفکرین وجود کو فوقیت دیتے ہیں۔ سارتر کے مطابق انسان اس کائنات میں پھینک دیا گیا ہے اور اسے ایک ایسی کائنات کا سامنا ہے جو اجنبی اور نامانوس ہے۔ نتیجتاً ایک روحانی تنہائی اُس کا مقدر بن

جاتی ہے۔ اس موضوع پر نئے پرانے اور روایتی غیر روایتی فلسفیوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے تحت لکھا ہے اور انسانی وجود کی معنویت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ تاہم سوالات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور شاید ہمیشہ ہی جاری رہے گا۔ اس لیے کہ زمانے کے تغیرات اور زندگی کے بدلتے ہوئے حقائق انسانی عقل وخرد کو غور وفکر کے لیے نئے سوالات اور تناظرات فراہم کرتے رہیں گے۔

ادب وشعر کا فلسفہ وحکمت سے گہرا تعلق ہوتا ہے لیکن ادب چونکہ دقیق اور مجرد افکار کو جمالیاتی پیرایے اور زندگی کے تجربے کی زبان میں بیان کرتا ہے، اس لیے اُس کی اثر پذیری کا دائرہ نہ صرف وسیع ہوتا ہے بلکہ وہ اپنی معنویت کا ابلاغ بھی براہِ راست انسانی طرزِ احساس کی سطح پر کرتا ہے۔ ادب کی یہ وہ صفت ہے جو اُسے دوسرے علوم وفنون سے ممیز کرتے ہوئے ایک انسان کے تجربے میں دوسرے کی شرکت کے ذریعے معنویت کی ترسیل کا دائرہ بڑھاتی ہے۔ اب جون ایلیا کی اسی نظم (بے اثبات) کو دیکھیے۔ یہ انسانی طلب کی ایک کیفیت کو ظاہر کرتی ہے جس کے تحت شاعر ایک طرف اپنے ذہنی رُجحانات کی انفرادیت کے باعث اپنے اطراف کی کائنات کے لیے اجنبی ہے مگر وہ اس کائنات میں بہر حال موجود ہے، لہٰذا اپنے ہونے بلکہ ناگزیر ہونے کا اثبات چاہتا ہے۔ یہ اُس کی فطری انسانی طلب ہے لیکن اُس کا تجربہ اُسے بتاتا ہے کہ یہ طلب کامگار نہیں ہے اور اس کا حاصل صرف مایوسی ہے اور یوں وہ اپنے کچھ بھی نہ ہونے کی اذیت سے دوچار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اذیت کا یہ احساس جون ایلیا کی شاعری میں جدید غزل کے نمایاں تر موضوعات مثلاً تنہائی، بے یقینی، لاحاصلی، لایعنیت، رائگانی، لاتعلقی اور خود مرکزیت جیسے رجحانات کے تحت چہرہ نمائی کرتا نظر آتا ہے۔ جون ایلیا کے فکری رُجحانات پر ایک سرسری نگاہ سے بھی اس امر کا اندازہ بآسانی ہو جاتا ہے کہ وہ ماورائے وجود اور مابعد الطبیعیاتی حقائق پر یقین اور اُن سے دل چسپی کا کوئی حوالہ نہیں رکھتے تھے۔ چناں چہ ایک نوع کی لاادریت اور بے یقینی

اُن کی تخلیقی زندگی اور فکری فضا کا حصہ بن چکی تھی جسے اُن کی نفسیاتی کیفیات یا سائیکی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ افتادِ طبع اور میلانِ فکر ایک دن میں پیدا نہیں ہوا، اس میں ایک طرف تو قدیم و جدید مغربی اور مشرقی فلسفوں (خصوصاً وجودیت) کا دخل تھا اور دوسرے سید محمد تقی کی فکری جہات، جن میں جون ایلیا ہمہ وقت موجود ہوتے تھے اور جس کی ساری بنیاد تعقل پسندی پر تھی۔ اس کا اظہار ان کی شاعری میں بہت تواتر کے ساتھ مختلف انداز میں ہوا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وجودی اثبات و معنویت کا موضوع اُن کے لیے کس درجہ اہم رہا ہے:

اور پھر میں نے
موجود کے دائرے کی نہایت پہ نالہ کیا
اے یقیں کے گماں
اے گماں کے یقیں
اے ازل آفریں
اے ابد آفریں
اے خدا الوداع
اے خدایاں خدا
الوداع، الوداع

(رمزِ ہمیشہ)

جون ایلیا کی فکری دنیا کسی طے شدہ اعتبار پر قائم نہیں ہے۔ وہ مسلمات کا انکار کرتے ہیں اور کبھی کبھی خود نئے مسلمات کے داعی بن کر سامنے آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اُن کا تخلیقی اضطراب اُنھیں ہمہ وقت ایک کشمکش سے دوچار رکھتا ہے اور وہ مسلسل نفی و اثبات کی کیفیت سے گزرتے رہتے ہیں۔ مگر ایسا کیوں؟

اس کا سبب شاید یہ ہے کہ وہ جب نفی کرتے ہیں تو بھی دراصل نفی نہیں کرتے اور جب اثبات کرتے ہیں تو بھی اثبات نہیں کرتے۔ اُن کے یہاں دراصل ہاں اور نہیں کا تصادم چلتا رہتا ہے جو بسا اوقات ایک گہری تلخی پیدا کردیتا ہے اور پھر وہ نہایت سفاکی کے ساتھ طنز و استہزا سے کام لینے لگتے ہیں اور اُن کے خاص لہجے کے شعر ہمارے سامنے آتے ہیں:

یہ جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

ہم نے خدا کا رد لکھا، نفی بہ نفی لا بہ لا
ہم ہی خدا گزیدگاں تم پہ گراں گزر گئے

جو اک نسلِ فرومایہ کو پہنچے
وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم

بعض اوقات اشعار میں لفظ یا پیرایۂ بیان اس درجہ شدید ہوجاتا ہے یا وہ اپنے احساس کی تلخی کو اس طرح بیان کرتے نظر آتے ہیں کہ اُن کا لہجہ ہی نہیں، اسلوب تک ایک قطعی غیر جمالیاتی سطح پر اپنے اظہار میں مطلق عار محسوس نہیں کرتا، مثلاً:

چبا لیں کیوں نہ خود اپنا ہی ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اُن کا یہ پیرایۂ بیان معاصر شاعری میں الگ سے شناخت پانے کے باوجود اُن کا اصل اسلوب نہیں ہے، بلکہ اگر ہم اُن کے کلام کو اس کی کلیت میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی محض ایک پردہ ہے، اظہار کا صرف ایک پیرایہ ہے۔ کیوں کہ ان کے پورے تخلیقی تناظر میں ساری جھنجلاہٹ، تلخی، کہیں کہیں کھردراہٹ کے ساتھ ساتھ جاری نظر آتا مکالمہ، لہجے کی دروبست، مزاج کی رومانیت اور کہیں کہیں تو بہت

زیادہ مزین مصرعوں جیسی خصوصیات مل کر دراصل وہ اسلوب اختیار کرتی ہیں جسے ہم عصری شعری تناظر میں جون ایلیا کا ''جداگانہ اسلوب'' کہہ سکتے ہیں۔ وہ اسلوب جسے جون ایلیا سے الگ کرنا ممکن ہی نہیں اور جسے کوئی اور کوشش بھی کرے تو اس طرح اختیار ہی نہیں کرسکتا۔ بلاشبہ جون ایلیا مکالمے کو مصرعے میں ڈھالنے کے ہنر سے بخوبی واقف تھے اور مکالمے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے لہجہ بھی شعروں میں سمویا ہے:

کیا وہ بساط اُلٹ گئی؟ ہاں وہ بساط اُلٹ گئی
کیا وہ جواں گزر گئے؟ ہاں وہ جواں گزر گئے

جون ایلیا اپنے اس مکالماتی لہجے کے بارے میں اپنی پہلی کتاب ''شاید'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

میں نے جو ایک زمانے میں بلند آہنگ اشتراکی نظمیں کہیں، ان پر میرے اسٹیج کے دور کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میری بہت سی غزلوں کا مکالماتی لہجہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

لیکن جون ایلیا کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دور کی یادگار غزلوں میں صرف مکالمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایک طرح کا ڈرامائی عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ سسپنس ڈرامے کا لازمی جزو ہے۔ یہی عنصر جون ایلیا کے اشعار میں اچانک اور اکثر و بیشتر ایک غیر متوقع صورتِ حال کے ساتھ سامنے آجاتا ہے جیسے:

بہت نزدیک آتی جا رہی ہو
بچھڑنے کا ارادہ کرلیا کیا

ہمارا عمر بھر کا ساتھ ٹھہرا
سو میرے ساتھ تُو دن بھر نہ رہیو

کیا کہا عشق جاودانی ہے

آخری بار مل رہی ہو کیا

ان اشعار میں بھی ڈرامائی عنصر کے ساتھ ساتھ جون ایلیا کی بے یقینی کی کیفیت بہت نمایاں ہے۔ دراصل جون ایلیا کی بے یقینی اُفقی اور عمودی ہر دو سطح پر موجود ہے۔ اور انھوں نے ''شاید'' کے دیباچے میں بار بار یقین سے محروم ہو جانے کی اذیت اور اُس سے پیدا ہونے والی لایعنیت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> میں فلسفے کا مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اپنی تمام تر یقینیات سے محروم ہو گیا۔ اس کے بعد میری یہ کیفیت ہوئی کہ اگر ایک زاویہ قائم دو حادہ زاویوں کے برابر ہوتا ہے تو ہوا کرے، میری بلا سے۔

جیسا کہ سطورِ گزشتہ میں عرض کیا، بے یقینی جون ایلیا کا بنیادی مسئلہ ہے جو اُن کے ہاں کبھی انسانی وجود کی بے معنویت کو تسلیم کر لینے سے کبھی زندگی کے مسائل سے، کبھی حالات کے تغیر سے اور کبھی خود اپنے احساس کی کیفیات کی تبدیلی سے پیدا ہوتا ہے۔ جون ایلیا کے تمام مجموعوں کے نام ''شاید''، ''یعنی''، ''لیکن''، ''گویا'' اور ''گماں'' جو انھوں نے خود رکھے یا اُن کی شاعری سے اخذ کیے گئے، بے یقینی ہی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ٹوٹا ہوا دل جادۂ تحقیق پہ رکھنا

بنیادِ تغیر مری جاں ہے کہ نہیں ہے

تو اس میں ایک معیارِ تحقیق اور زاویہ تجزیہ ملتا ہے، اس طرح کی تحقیقی قطعیت جون ایلیا کے یہاں شاید ہی نظر آئے گی۔

جہاں تک تنہائی اور لایعنیت کا سوال ہے تو بے یقینی، اجنبیت کو اور اجنبیت، لایعنیت کو جنم دیتی ہے۔ دراصل ہر سطح پر بے یقینی اور اعتبار کا خاتمہ انسان کو بالکل تنہا اور مایوس کر دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج کی صنعتی و تجارتی زندگی میں جب انسان ٹوٹتی اقدار اور بکھرتے رشتوں کے بیچ خود کو مشین کا پرزہ بننے سے بچانے کے لیے خود آگہی

اور عرفانِ ذات کی تلاش میں ہے تو اُسے گہرے سناٹے اور ہول ناک تنہائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

دل عزادار تمنا ہی رہا
میں تجھے پا کے بھی تنہا ہی رہا

عہدِ رفاقت ٹھیک ہے لیکن مجھ کو ایسا لگتا ہے
تم تو میرے ساتھ رہو گی، میں تنہا رہ جاؤں گا

یہ تنہائی انسان سے انسان کو بیگانہ بنا دیتی ہے:

سب سے پُر امن واقعہ یہ ہے
آدمی، آدمی کو بھول گیا
یعنی تم وہ ہو، واقعی؟ حد ہے
میں تو سچ مچ سبھی کو بھول گیا

سب کو بھولنے کے بعد جون ایلیا غالباً وجودیت سے متاثر ہو کر اپنی معنویت کو تلاش کرنے لگتے ہیں تو اپنے باطن کی انھی پیچیدگیوں سے دوچار ہو جاتے ہیں جن سے آج کا جدید انسان دوچار ہے لیکن وہ ایک سچے، کھرے اور باشعور تخلیق کار کی طرح اس اعتراف میں بالکل نہیں جھجکتے:

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

یہ بات بھی ہے کہ لمحوں کے لوگ جائیں کہاں
اگر فریب بقائے دوام کے نہ رہیں

یہ فریب بقائے دوام ختم ہونے سے جون ایلیا زندگی کے المیے سے دوچار ہو جاتے ہیں جس کی طرف اونا موبو نے "زندگی کا المیہ مفہوم" (The Tragic Sense of Life) میں اشارہ کیا ہے اور تب جون ایلیا کو معلوم ہوتا ہے کہ تو الہ نگل لینے کے باوجود دیوتاؤں والی ذاتی ابدیت انسان کا مقدر نہیں اور وہ ساری عمر marginal situation میں دوڑنے کے باوجود موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

کتنی دلکش ہو تم، کتنا دل جُو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

اس ستم کا نتیجہ اُس لایعنیت کی صورت میں نکلتا ہے، جس کی طرف جون ایلیا نے اپنے دیباچے میں اشارہ کیا تھا:

کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں

یہ ٹوٹ پھوٹ آج کے انسان کا مقدر ہے جو تہذیبی اقدار اور تخلیقی و تعمیری عناصر سے کائنات کو خالی کرنے کے بعد اپنی تلاش میں ہے مگر جون ایلیا نے اس سارے عمل کے ردعمل میں اپنا ایک جداگانہ اسلوب اردو شاعری کو دیا ہے جسے جون ایلیا کا خاص حصہ کہا جاسکتا ہے۔

جانِ چمن رہو گے تم...!

شاعری— انسانی تاریخ کا سب سے خوب صورت ترین سچ! ایک ایسا سچ جس کی لہریں، تقویمِ محدود سے کہیں آگے تک رواں ہیں۔ یہ وہ سچ ہے جس نے قدیم اور حادث کے معاملات بھی سلجھائے، درون اور بیرون کے فلسفے ہزار ہا شکلوں، لہجوں اور طریقوں سے نمٹائے۔ یہ شاعری ہی تھی جس نے انسان کو انسان کے دروں کی خبر دی، جس نے اپنی دریافت سے احساسات کا وہ در وا کیا، کہ جس کا کھلنا، جہانِ معانی کی اس عظیم الشان اقلیم میں راہ دیتا ہے جہاں پھول گفتگو کرتے ہیں، پانی خواب دیکھتا ہے، مٹی کلام کرتی ہے اور درخت اپنے سائے میں بیٹھنے والے مسافروں کی میزبانی کرتے ہیں۔ شاعری کے روزِ اوّل سے لے کر لمحۂ حاضر تک یہ پُراسرار داستان اپنے خاص الخاص رازداروں پر ہی کھلی ہے، اس کی حالتیں رمز پرور، اس کا مکالمہ کہیں شور اور کہیں سحر انگیز ہے، یہ وہ بانوے شہر ہے جس نے اپنی چلمن کا رخ بھی کبھی نامحرموں پر عیاں نہیں ہونے دیا— جمال تو دور کی بات ہے۔ ''لکھنے'' اور ''کہنے'' والوں کے درمیان فرق، فصلِ عظیم یہی تو رہا ہے کہ جانے کتنے ہی آئے جنھوں نے اپنی اپنی بساط بھر ''بہت زور غزل

میں مارا'' کے مصداق ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن...! نہیں... کامیابی انھی کو ملی جو اس لیلائے پُر افسوں کے حضور مکمل و اکمل حاضری، کیفیت اور جذب سے آئے۔ بانوئے شہرِ سخن، عارفۂ اسرار کائنات یعنی شاعری کے انھی رازداروں، انھیں محرموں، انھی اعلیٰ والیاؤں میں سے ایک نہایت سرکش، نہایت حال خیز اور نہایت رمز پرور محرم اور محبوب کا نام جون ایلیا ہے۔

جون ایلیا مدینۃ الشعر کا بابِ کرامت ہے۔ ایک ایسا بابِ کرامت جس نے اردو شاعری میں اس لہجے کو از سرِ نو دریافت کیا جس لہجے کی رمق قریب قریب ڈوب چکی تھی۔ وہ سرمستِ ذات ایسا تھا کہ جس نے اپنے لہجے اور اپنے اسلوب سے ایک ایسے نصاب کی شرح تحریر کی جس کی مثال کہیں اور سوائے جون ایلیا کے کہیں نہیں ملتی۔ یہ اس عظیم سرکش کے دروں کا سچ ہی تو ہے کہ آج بھی جونِ عظیم ایلیا کا کلام، اپنی سادگی اور رمز کی پرکاری کے سبب گروہانِ کاریگراں کے تمام لکھے ہوئے پر بھاری ہے۔

جون ایک ایسا دریا ہے جس کی مستی نے اپنی تمام سرکشی اور بھرپور روانی کے باوجود حرمتِ حرف و لفظ کی کسی بستی، کسی قریے پر چڑھائی نہیں کی۔ یہ دریا اپنی مستی سے اپنے سینۂ لخت لخت سے چیختا ہوا جو نکلا ہے تو اپنے اندر ہی سمایا ہے۔ اس کی چیخ ایسی بہترین چیخ بنی کہ آج بھی محبت کے تھکے ہوئے وجود، ذات و لاذات کی چڑھائیوں سے گر کر ہارے ہوئے نفوس، جون کی شاعری کو کلامِ مقدس کی طرح جانتے ہیں۔ جون اپنے عہد کا جبلِ احد تھا، ایسا جبلِ احد جس کے سائے میں حرف و لفظ کے تمام منافقین و کافرین بھی اگر آئے تو فیض یاب ہو کر گئے۔ وہ سب میں رہ کر بھی سب جیسا نہیں تھا اور اس کی طرف کوئی وحی بھی نازل نہیں ہوتی تھی— لیکن پھر بھی اس کے چاہنے والے اس کے ناز اٹھانا اپنا فخر جانتے تھے۔ وہ ایسا محبوب تھا کہ جس پر ناز جچتا تھا، غرور کھلتا تھا اور بے نیازی سجا کرتی تھی۔ اس نے اپنے کلام میں کوئی جھوٹ نہیں بولا، بالکل اسی

طرح جس طرح اس نے اپنی زندگی میں بہت سے بیج بھگتے اور ہر بیج کا صلہ بھی۔

جون ایلیا اردو ادب کا وہ واحد ادیب ہے جس کے ہاں ادب اپنے کُل کے ساتھ ورود کرتا نظر آتا ہے۔ وہ واحد تخلیق کار ہے جس کا کہا ہوا شعر آج بھی کوئی اپنے لہجے میں نہیں پڑھ سکتا۔ کلام کے ساتھ شخصیت کا یہ اٹل آہنگ ہی وہ سبب ہے جس نے جون کے کلام کو آفاقی انفرادیت عطا کی۔ جون کا سب سے بڑا اور خاص کمال اردو شاعری میں "میں" کی حیثیت، خاصیت اور ہیئتوں کا اجرا ہے۔ "میں" کا جتنا بڑا نفوذ جون کے ہاں ہے، کسی اور کے ہاں نہیں۔ جون نے اپنی انفرادی "میں" کو اس انداز سے برتا اور دیکھا ہے کہ وہ انفرادی "میں" اپنے نفسِ ذات سے نکل کر اجتماع کی آواز بن گئی۔ جون کی "میں" نے بڑے معجزے برپا کیے ہیں۔ کہیں یہ "میں" محبت میں سخت جھنجھلائے ہوئے شخص کی "میں" بن کر سامنے آتی ہے، اور کہیں یہ "میں" منافقت، عوام پر جاری کردہ جبر، اور ذات کی عجیب وغریب منطق سے الجھ کر باقاعدہ خطاب کرتی نظر آتی ہے:

اے خدا! جو کہیں نہیں موجود
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

جون کا کمال یہ ہے کہ جون کا شعر انسانی وشخصی نفسیات کے اس قدر قریب رہ کر مکالمہ کرتا ہے کہ ذرہ برابر بھی بوجھل پن نہیں پیدا کرتا۔ لطف اور حیرت کی ایک ایسی رو دوڑ جاتی ہے کہ جیسے آپ نے کوئی شعر نہیں سنا، اپنے سامنے کوئی ورائے عقل بات سرانجام پاتے دیکھ لی ہو۔ وہ اپنے قاری کے ساتھ بالکل اجنبی نہیں۔ جون کو اگر ہم ان نہایت چند خوش نصیب تخلیق کاروں میں شامل کریں جن کا قاری ان سے والہانہ محبت کرتا ہے تو جون بلامبالغہ سرِفہرست نظر آئے گا۔ اس کے کلام میں موجود بے ساختگی جون کا وہ نہایت خالص اور ذاتی مقام ہے جہاں کوئی اس کا شریک تو دور کی بات، پاس بھی نظر نہیں آتا۔ جون کی زمینیں اور بالخصوص وہ تمام زمینیں جن کی ردیف "ہاں تو"... تھا

کیا"...."کوئی ہے" اور ایسی تمام زمینیں جن میں ذات سے مکالمہ کیا گیا ہے، ایسی خطرناک اور اٹل زمینیں ہیں کہ کوئی بھی "بے کیفیت و بے برکت" شاعر اس زمین میں غزل کہتے ہوئے جون کے اثر سے بچ ہی نہیں سکتا۔

جونِ عظیم ایلیا کی شاعری کا سب سے محبوب و مرغوب تلازمہ اور موضوع "ذات" ہے۔ کچھ ناعاقبت اندیش لوگ جون کی شاعری کے بارے میں بڑے فلسفیانہ انداز میں یہ موشگافی کرتے نظر آتے ہیں کہ "جون ایلیا کی شاعری دو تین پرتوں تک ہی محدود ہے۔" یہ بات اگر بالفرضِ محال مان بھی لی جائے تو ان تین پرتوں میں سے پہلی پرت ہی "ذات" ہے اور جس تخلیق کار کی تخلیق سازی کا دورانیہ شروع ہی "ذات" سے ہو رہا ہو، اس کی باقی جہات کا اندازہ لگانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ادب کی تمام منقولہ و غیر منقولہ دستاویزات کا جائزہ لیا جائے تو ان تمام دستاویزات میں جو لفظ جلی حروف میں لکھا ہوا ملے گا، وہ یہی "ذات" کا لفظ ہوگا۔ جون کی شاعری کا محیط "ذات" کی نہایت بے قرارانہ حیثیت سے ہوتا ہوا، اجتماع در اجتماع سفر کرتا ہوا خود خدا کی زبان بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات نہایت واضح رہے کہ جو خدا جون کے ہاں زیرِ بحث آیا ہے، وہ جون کا ذاتی خدا ہے۔ اس خدا کا کوئی معاملہ کسی اور یا یوں کہہ لیجیے کہ عوام الناس میں رائج و نافذ خدائی نظریے سے ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جون نے جہاں جہاں خدا سے مکالمہ کرتے ہوئے کوئی بات کی ہے، وہاں وہاں اس کا لہجہ تیز ہوتے ہوئے بھی ایک خاص طرح کے محبوبی آہنگ سے خارج نہیں ہوا... یہ اہلیت نہیں تھی، یہ کوئی کمالِ فن نہیں تھا، یہ درحقیقت جون کے بہت اندر کی وہ معصومیت اور وہ سچ تھا جو اسے تحقیق، سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ زرِ فکر بازاری دکانوں پر لٹانے، فلسفی کسبیوں کا مجرا دیکھنے سے کہیں بہتر یہی راہ تھی جو جون کے اندر از خود بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ خدا کے حضور آدمی کی وکالت، یزداں کے سامنے حضرتِ انسان کا وجود ثابت

کرنا جون کی فکری مجبوری تھی، کیوں کہ وہ بہت پہلے کہیں کہہ چکا تھا ''میں اپنا آدمی ہرگز نہیں، لوح و قلم کا آدمی ہوں۔'' یہ بات کوئی معمولی بات ہے ہی نہیں۔ یعنی یہی وہ جداگانہ روش تھی جس کے سبب جون کا اسلوبِ شاعری اور آہنگِ شخصیت اسے تمام ہم عصر اہلِ سخن سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ وہ جیسا اپنے کلام میں ہے، ایسا ہی خالص وہ اپنی شخصیت میں ہے۔ اس کی شخصیت اتنی بڑی شخصیت ہے کہ دریا مثال ہے۔ اس کی تمام سرشاری اور مستی اس کے کلام کا آہنگ بنی، اور کائنات گواہ ہے کہ کلام تو بہت دور کی بات ہے، اگر کوئی ایک ذرہ بھی اپنے داخلی سچ کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جون تو پھر ایک جیتی جاگتی کلام کرتی شخصیت تھی۔

جون کی شاعری ایک مثال ہے کہ لہجے کا بے ساختہ پن بھی وہ بڑی شاعری تخلیق کر سکتا ہے جس کی طرف بہت سے لوگوں نے خود ساختہ سنجیدگی اور گمبھیرتا اوڑھے ہوئے سفر کیا ہے۔ وہ ہنس کر ان معاملات کی گرد اڑا گیا جن پر بات کرتے ہوئے بہت سوں کی سانس پھول جاتی ہے۔ نسلِ انسانی جیسے جیسے اپنے ارتقا کی سیڑھیاں چڑھے گی، جیسے جیسے فرد کا شعوری تنفس بحال ہوتا رہے گا، فرد جیسے جیسے خدا اور ذات کے قریب ہوتا جائے گا — جون کا یہ شعر تا ابد لوحِ زمان و مکان پر لو دیتا رہے گا!

کربِ تنہائی ہے وہ شے کہ خدا
آدمی کو پکار اٹھتا ہے

وہ چمن ہی نہیں جانِ چمن بھی تھا۔ جب تک یہ چمن قائم ہے جانِ چمن تم ہی رہو گے جون —!

○

جون ایلیا اور ایک عام قاری

غالباً مہینہ پہلے کی بات ہے کہ بہن نسیم سیّد کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ۲ر جولائی ۲۰۱۱ء کو ٹورانٹو میں محترم جون ایلیا پر ایک سیمینار منعقد کر رہی ہیں۔ سہ پہر میں سلسلۂ تقاریر اور شام کو محفلِ مشاعرہ۔ یہاں تک تو بات ہمیں بالکل بے ضرر لگی۔ پھر فرمایا کہ اس میں ہماری شرکت کو لے کر کوئی عذر قبول نہ کیا جائے گا۔ چلیے، مانا۔ مزید ارشاد ہوا کہ مشاعرے کے ساتھ ساتھ حصۂ تقاریر میں بھی ہماری شرکت طے ہے۔ ہم نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ اُس پر بھی صاد کر دیا تو حکم ہوا کہ اس موقعے پر ایک کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ اس کے لیے جون صاحب کی شاعری کو بنیاد بنا کر ایک مقالہ جلد از جلد تحریر کیا جائے تاکہ اُسے شاملِ اشاعت کیا جا سکے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس نادر شاہی حکم پر کسی ردِعمل کا اظہار کرتے کہ بہن صاحبہ نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا کہ مصروفیت بہت ہے، چناں چہ باقی باتیں تمھاری ٹورانٹو آمد پر!

میں — نہ تو کوئی نقاد ہوں اور نہ ہی کوئی مضمون نگار۔ میں جون صاحب کی شاعری پر کیوں کر قلم اُٹھاؤں؟ اور پھر اس حقیقت سے بخوبی آشنا کہ کانچ کے گھر میں رہنے

والے کسی پر پتھر اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ لیکن ہوا کے رُخ پر چلتے ہوئے جون صاحب کے احباب کے کچھ تعریفی مضامین اکٹھے کر کے اُن کی مدد سے میں بھی جون صاحب پر ایک مضمون گھڑ ماروں، یہ میری طبیعت نے گوارا نہیں کیا۔ چناں چہ طے ہوا کہ جون صاحب کی شاعری کا بالکل ایک عام قاری کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے اور اُس کا جو اثر ذہن قبول کرے، اسے بلا کم و کاست اپنے قاری کی نذر کر دیا جائے۔

جون صاحب کا مجموعۂ اولیں ''شاید'' میں ''نیاز مندانہ'' اور شاعری ہمیشہ میرے لیے دو علاحدہ کتابوں کی حیثیت رکھتے رہے ہیں۔ ''نیاز مندانہ'' — ایک نثری کتاب جو جون صاحب کی ذات سے آپ کو متعارف کرواتی ہے اور دوسرا حصہ شاعری — ایک شاعری کی کتاب جو اُس کے قاری کو کبھی جون صاحب کی فکر سے روشناس کراتی ہے اور کبھی خود اُن کی ہی طرح آپ کو بھی شک و تشکیک کے دھندلکوں میں بھٹکائے پھرتی ہے۔ لیکن جون صاحب کی ایک مکمل شبیہ تخلیق کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ''نیاز مندانہ'' سے ''گویا'' تک کا مکمل سفر طے کیا جائے۔ سو، میں نے شاعر فرحت شہزاد کو ایک طرف کیا اور شاعری کے ایک عام قاری کی طرح (جو کہ میں حقیقتاً ہوں بھی) یہ سفر ''نیاز مندانہ'' سے آغاز کیا۔

مجھے اعتراف ہے کہ نیاز مندانہ کا مطالعہ منٹو یا عصمت چغتائی کے کسی افسانے کا مطالعہ نہیں کہ ایک ہی نشست میں پڑھ مارا اور اُس سے جتنا محظوظ ہوا جا سکتا تھا، ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔ ''نیاز مندانہ'' بقول جون صاحب، سوا دو سو صفحات سے متجاوز ہونے پر بھی نامکمل تھا۔ یہ محترم انور شعور صاحب کا احسان ہے کہ اُن کے مشورے پر اُس کی صرف تلخیص ہی شاملِ اشاعت کی گئی۔ اب اس تلخیص کو مکمل طور پر اپنے شعور کا حصہ بنانا ہو تو ضروری ہے کہ اسے رُک رُک کر، سوچ سوچ کر کئی بار پڑھا جائے، ورنہ جون صاحب کی ذات پر پڑا پردہ اُٹھنے کی بجائے مزید دبیز ہو جاتا ہے۔

میں نے ''نیاز مندانہ'' چار پانچ بار پڑھی۔ اور آخر فیصلہ کیا کہ جتنا سمجھ پایا ہوں،

اُسی کو غنیمت جان کر قدم آگے بڑھاؤں، وگرنہ پہلی منزل پر ہی سر پٹکتا رہ جاؤں گا اور وقت کا کارواں گزر جائے گا۔

میرا ''ٹیک'' نیازمندانہ سے مختصراً یہ رہا کہ جون صاحب کے ایک بچکانہ، کورے کاغذ سے ذہن پر ابتدا میں ہی وہ نقوش کھود دیے گئے جو اکثر تخلیق کاروں کے ذہن، عمری چالیس کہ پچاسویں سیڑھی چڑھتے ہوئے بھی کم ہی قبول کرتے ہیں۔ اُنھیں سفر کی ابتدا ہی اُن راہوں پر کرائی گئی جن پر منزل کبھی نہیں آتی اور ان راہوں کا زندگی کی سچی حقیقتوں سے سامنا بھی کم کم ہی ہوتا ہے۔

آٹھ برس کی عمر کے لیے کسی لڑکی کا نہ صرف ''قتالہ'' ہونا بلکہ یہ شعر کہلوانا کہ:

چاہ میں اُس کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار پر

تپِ دق کو انقلابی بیماری جان کر اُس کی تمنا کرنا، اور پھر جو خاص بات، میرے خیال میں اُنھیں زندگی کے آج اور آنے والے کل سے مزید کوسوں دور لے گئی، وہ تھی اُن کا ماضی کے حوالے سے نہ صرف ڈرامے لکھنا، بلکہ اُن میں خود ہی ایکٹ بھی کرنا۔ اور یوں ذہنی طور پر اُس دنیا میں رہنا جس کا اُن کی آج اور آنے والی کل کی حقیقتوں سے کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہ تھا۔

اُن کا یہ شعر میری اس سوچ کو مزید تقویت دیتا لگتا ہے کہ:

ہوں جہاں زر، نہ قیمتِ یوسف
کہ وہ بازار بے درم تازہ

وقت سے پہلے فلسفے کے اندھے غاروں کا سفر گویا کہ اُنھیں سالم نگل گیا۔ ایک جگہ خود جون صاحب کھل کر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''میں فلسفے کا مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اپنی تمام تر یقینیات سے محروم ہوگیا۔''

میرے خیال میں جون صاحب کا یہ ایک جملہ اُن کی پوری زندگی اور شاعرانہ رویے کی مکمل وضاحت کے لیے کافی ہے۔ اور اب میں اس زادِ سفر کے ساتھ اُن کی شاعری کے جہان میں عازمِ سفر ہوتا ہوں۔

ن م راشد کو عام قاری کا نہیں بلکہ شاعروں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ جون صاحب کی شاعری کے جہان میں سفر کے دوران بے شمار موڑ ایسے آئے کہ میں انھیں شاعروں کا شاعر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ پانچوں کتابوں میں سفر کے دوران ایک بات بہرحال طے رہی کہ جون صاحب کا قلم اردو زبان کی ایک ایسی آب دار تلوار ہے کہ جس کے سامنے آنے والے لفظ کو اپنی تراش خراش کے مرحلے سے گزر کر، ہیرا بن کر، شعر کی انگوٹھی میں جڑے جانے کا احساس اس عمل سے گزر جانے کے کافی دیر کے بعد ہوتا ہے۔ نظموں میں مجھے اُن کا یہ جوہر مزید واضح طور پر کھل کھیلتا نظر آتا ہے، بلکہ میں تو ایک قدم مزید آگے بڑھ کر برادرم جاوید صبا سے متفق ہوتے ہوئے کہوں گا کہ ان کا نظمیہ رنگ اُن کے رنگِ تغزل پر اس قدر گہرا ہے کہ ان کی اکثر غزلوں پر نظم کا گمان گزرتا ہے۔

میں نے جون صاحب کی شاعری سے متعلق جتنے مضامین پڑھے، اُنھیں ان کی عظمتِ شاعرانہ کے سامنے سجدہ ریز پایا۔ مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں شامل مضامین میں اُن کے کلام میں موجود بیشتر ہیرے اور جواہرات ضرور اکٹھے ہو گئے ہوں گے۔

چناں چہ میں انھیں دُہرانے کے بجائے یہاں کچھ ایسے رنگوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جن کا جون صاحب کے ہاں کم کم ہونا، یا لاپرواہانہ انداز میں چھپا ہوا سا ہونا ان کے قاری بدمزہ سا کر جاتا ہے۔

اگر میرا قلم یہاں جون صاحب کے کسی شیدائی کے دل کو ٹھیس پہنچانے کا سبب بنے تو اُن سے میں پہلے ہی معذرت چاہتے ہوئے ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کرتا چلوں کہ میں نہ کوئی نقاد ہوں اور نہ ہی مضمون نگار۔ میں نے جون صاحب کے جہانِ شعر میں

ایک قاری کی حیثیت سے سفر کیا ہے اور اسی حیثیت سے اپنے تاثرات انتہائی دیانت داری کے ساتھ قلم بند کر رہا ہوں۔

عالمی اردو کانفرنس ۲۰۰۸ء حصۂ اوّل، مرتبہ جاوید صبا — میں شامل محترم مشتاق یوسفی صاحب کے مضمون ''جون بھائی'' سے ایک اقتباس:

> جون ایلیا کے ایک ہمدم اور ہمراز بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کے ڈھائی بجے اُن کے پھاٹک پر گھنٹی بجی۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے پہنچے تو جون ایلیا کھڑے تھے۔ فرمایا، ''جانی! میں اس وقت پیے ہوئے نہیں ہوں۔ میں اس وقت رینجر بن کر بڑے بھائی کو فون کرنا چاہتا ہوں کہ یا تو جائیداد کی تقسیم میں جون کے ساتھ زیادتی بند کرو ورنہ...'' اُن دنوں کراچی میں قتل و غارت گری کا زور تھا، اور شہر میں رینجرز گشت کر رہے تھے۔ لوگ قتل و غارت گری سے اتنے خوف زدہ نہیں تھے جتنے کے رینجرز سے تھے۔ دوست نے فون ملایا۔ جب بڑے بھائی صاحب فون پر آگئے تو جون نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور پکڑ کر ہچکتے ہوئے ہونٹ اس پر رکھ کر کہا، ''بھیا، میں رینجر بول رہا ہوں...'' بھائی صاحب قبلہ نے جواب میں جو کچھ کہا، اُسے خواتین کی موجودگی میں دُہرانا مناسب نہیں۔ فون پھینک کر جون ایلیا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹتے جاتے اور کہتے جاتے تھے کہ ''اس تہذیب نے ہمیں تباہ کر دیا۔ اس تہذیب نے کہیں کا نہ رکھا۔ اماں، خفگی اور خصومت میں بھی تہذیب کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ امروہہ کی تہذیب نے مجھے تباہ کر دیا۔''

اور اب — امروہہ کی تہذیب کے ہاتھوں تباہ شدہ شاعر کے، خطا معاف، کچھ بدتہذیب اشعار:

یار، پستاں تو گوشت پارے ہیں
رمزِ نزہت ہے وہ پیالۂ ناف

ہے مرا، یہ ترا پیالۂ ناف
اس سے تو غیر کو پلائیو مت

یہ میرا جوشِ محبت فقط عبارت ہے
تمھاری چکنی رانوں کو نوچ کھانے سے

ہائے تیری چھاتیوں کا تن تناؤ
پھر تری مجبوریاں، ناچاریاں

وہ بدن تھا غضب ہوس انگیز
تھے وہ شہوت کے دن، شہادت کے

ہم شہیدِ خیال، بے چارے
گئے رانوں کے درمیاں مارے

سطرِ مُو اُس کی زیرِ ناف کی ہائے
جس کی چاقو زنوں کو تاب نہیں

لب و پستان و ناف اُس کے نہ پوچھ
ایک آشوب کار ہے، اماں ہاں

عطش انگیز تر ہیں وہ بوسے
حرصِ شہوت میں تُو نہ تن، دم لے

وہ دمِ صبح غسل خانے میں
میرے پہلو سے شل گئی ہوگی

اور

ناف پیالے کی ہوس میں نہ بھلا دوں اس کو
سرِ پستاں سے جو تا زیرِ کمر ہے درپیش

وغیرہ وغیرہ وغیرہ...

مندرجہ بالا اشعار میں نے جون صاحب کی ایک نہیں بلکہ تمام مجموعاتِ شاعری میں سے لیے ہیں اور میرے قلم کی زبان کو گویا کسی نے کاٹ کر پھینک دیا ہے۔ میں انتہا درجے کی بدمذاقی اور بدذوقی کے طوفان میں گھرا سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ اشعار واقعی اسی جون ایلیا سے تخلیق پائے ہیں کہ جو امروہہ کی تہذیب کے ہاتھوں اس قدر تباہ حال تھے کہ تمام تر ناچاقیوں کے باوجود اپنے بڑے بھائی کو دھمکی دینے کے لیے بھی کوئی نازیبا لفظ استعمال نہ کر پائے اور انھیں بھائی کہہ کر مخاطب کیا؟ کیا امروہہ کی تہذیب اپنی محبوب کے بارے میں اس طرح کی زبان میں، ایسے اشعار کہنے کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوئی؟ اور یا پھر مجھے شکایت خالد احمد انصاری اور ان کے معاونین سے ہونی چاہیے کہ جنھوں نے جون صاحب کے جوشِ محبت میں (غالباً) ہر اُس تحریر کو شاملِ اشاعت کرلیا جو انھیں میسر آئی، یہ

سوچے بغیر کہ کسی بھی شاعر کا کہا ہوا ہر شعر قابلِ اشاعت نہیں ہوتا۔

غلطی کسی کی بھی ہو، مندرجہ بالا اشعار نے اردو شاعری کے ایک عام قاری یعنی میرے نظر میں جون ایلیا صاحب کی شاعرانہ عظمت کو ایک شدید دھچکا لگایا ہے۔

جون صاحب کی شاعری میں ایک اور رنگ کے فقدان نے بھی مجھے خاصا مایوس کیا۔

ان کا قلم اپنے اطراف، اپنے علاوہ کسی کے بھی ساتھ ہونے والے ظلم سے تقریباً بیگانہ ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں، چھ سال کی قتالہ کی محبت میں گرفتار ہو کر گال پر طمانچے کھانے والا شاعر ۴۰ء اور ۵۰ء کی دہائیوں میں اپنے اطراف نسلِ انسانی پر ڈھائے جانے والے عذاب پر دم سادھے سب کچھ دیکھتا رہا اور محبتیں کرتا رہا۔ وہ ۵۷ء سے آخری سانس تک پاکستان میں رہے۔ اس پورے عرصے میں اور بطورِ خاص ۸۰ء اور ۹۰ء کی دہائیوں میں پاکستان میں اُن کی آنکھوں کے سامنے بہنے والے لہو نے بھی اُن کے قلم سے خون کی ایک بوند تک نہ ٹپکوائی۔ اور یہ بات، یہ کمی اُن کے کلام میں اُن اشعار کے ساتھ مل کر جو میں نے پہلے اس مضمون میں درج کیے ہیں، انھیں ایک مکمل، بڑے شاعر کی سند سے ذرا دور رکھتی محسوس ہوتی ہے۔

جون ایلیا، ایک عام قاری کے لیے ایک قادر الکلام اور انتہائی وسیع مطالعے کی دولت سے مالا مال، بہت زود گو اور کہنہ مشق لیکن اپنی ذات میں گم ایک خود غرض شاعر تھے۔ اُن کا غم، غمِ ذات اور اُن کے مسائل صرف اُن کے اپنے مسائل تھے۔ اپنی شاعری کے آئنے میں وہ ایک ایسا انسان نظر آتے ہیں جو خود ہی خود کو زخم لگاتا ہے اور پھر اپنے قاری سے اُن زخموں کی داد اور ہمدردی چاہتا ہے۔ وہ ایک طرف اس قدر اَنا پسند ہیں کہ اپنے سامنے خدا کو بھی نہیں گردانتے تو دوسری طرف اُسی اَنا کو ایک لمحۂ وصل پر قربان کرنے کو بھی تیار ہیں۔ وہ اپنے اطراف سے لاپروا بلکہ بے خبر ہونے کی وجہ سے رائگاں گئے اور اس رائگانی پر وہ فخر بھی کرتے ہیں۔ وہ تمام عمر ایک منفی فرسٹریشن کا شکار رہے اور اس فرسٹریشن

کی ایک عطا وہ اشعار ہیں جو صرف لچر کہلا سکتے ہیں۔ جون صاحب کو ایک سانس میں غالبؔ و اقبالؔ کے ساتھ بٹھانے سے پہلے اُن کے شیدائیوں کو غیر جانب دارانہ طور پر اُن کی شاعری کو مکمل طور پر پڑھ کر ایمان داری سے سوچنے کی شدید ضرورت ہے۔

اپنے قاری سے میری آخری عرض یہ ہے کہ جتنا حق مجھے اپنی سوچ کے مطابق اپنی رائے قائم کرنے اور اُسے بیان کرنے کا ہے، اتنا ہی حق آپ کو میری رائے کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا ہے۔ آپ میرے حق کو تسلیم کریں یا نہ کریں، میں آپ کے حق کی تائید کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے اس حق کو استعمال کرنے کے بعد اپنی رائے مجھ سے شیئر بھی کریں تو مجھے اپنا سپاس گزار پائیں گے۔

○

جون ایلیا — ایک صاحبِ طرز نثر نگار

جون ایلیا کے لیے لکھنا مشکل ہے — بہت مشکل۔ مشکل اس لیے کہ کون سے جون ایلیا پر بات کی جائے، اس نابغۂ فکر کے کون سے پہلو کو گرفت میں لیا جائے کہ ان کا تخلیقی وجود ادب کی کسی ایک نہیں بلکہ تمام اصناف سے جڑا ہوا ہے۔ اس کثیر الجہات کی کس جہت کا بیان ہو کہ جون ایلیا صرف ایک بے مثال شاعر ہی نہیں ایک باکمال اور بے مثال نثر نگار بھی تھے۔ وہ نثر نگار جس کا کوئی ثانی نہیں موجودہ دور میں۔ وہ صرف ایک فلسفی ہی نہیں ایک ماہرِ لسانیات بھی تھے۔ جون ایلیا نے بابائے فارسی رودکیؔ اور فردوسیؔ، نظیریؔ، رومیؔ اور حافظؔ جیسے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور انھیں اپنا مرشد اور استاد مانا۔ فارسی کے ان اساتذہ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''میں نے ایک تلمیذ کی طرح ان کا مطالعہ کیا۔ کسی اردو شاعر کو میں نے اس طرح نہیں پڑھا، اس گروپ کو میں 'دوستوں کے گروپ' کی شکل میں دیکھتا تھا، کسی حد تک اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے علم تھا کہ انھوں نے بھی انھی اساتذہ کا مطالعہ کیا ہے جن کو میں نے پڑھا ہے۔ اس اعتبار سے میں ان سبھی کو اپنے ایسے ہم سبق سمجھتا تھا جنھوں نے ایک ہی دا

نش گاہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بے شک ان میں سے چند میرے سینئر ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر مجھے نویں درجے کا طالب علم سمجھ لیا جائے تو میرے مقابلے میں غالبؔ اور میرؔ فائنل ایئر کے طلبہ تھے۔ تاہم تھے تو ہم ایک ہی کالج کے ساتھی لیکن فارسی کے عظیم اساتذہ... وہ تو مرشد تھے، استاد تھے اور اردو کے تمام بڑے شعرا نے ان عظیم فارسی اساتذہ سے کسبِ فیض کرنے کا اعتراف کیا ہے۔"

وہ مغرب اور مشرق کے فلسفیوں کا اپنی نگارشات مین تقابلی تجزیہ اس تفصیل سے پیش کرتے ہیں کہ ان کے مطالعے کی گہرائی اور تقابلی فکر پر دل عش عش کر اٹھتا ہے۔ ان کے برس ہا برس کے عمیق مطالعے نے ہی ان سے بیان دلوایا کہ "مغربی نظامِ فکر میں افلاطون اور ارسطو جس منصب پر قائم ہیں، ہماری روایت میں وہی مقام ابنِ سینا اور فارابی کا ہے۔" جون ایلیا نے عربی اور فارسی مفکرین کی نگارشات و افکار کا مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کے تراجم بھی اردو میں کیے ہیں۔ انھوں نے اسلامی تاریخ صرف پڑھی نہیں بلکہ اموی، عباسی اور فاطمی دور کے تمام اہم کرداروں کو اپنے لکھے ہوئے ڈراموں میں زندہ کردیا۔ ان کرداروں کی زبانی تاریخی واقعات کو مکالمہ بنا کے انھیں زبان دے کے ہزاروں افراد کے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ کہتے ہیں، "میں ان ڈراموں کے پیشِ نظر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسلامی تاریخ پڑھی نہیں، دیکھی ہے۔ ۶۸۰ء کا وہ منظر میرے سامنے کی بات ہے جب عبیداللہ ابن زیاد بن مسلم بن عمر باہلی شریک بن اعور حارثی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ سیاہ عمامہ باندھے ہوئے رات کے وقت کوفے میں داخل ہوا تھا۔ ابنِ زیاد کے لشکر نے توابین کے قائد سلیمان بن صرو خزاعی اور ان کے ساتھیوں کو میرے سامنے خون میں نہلایا تھا۔ خاندانِ برمک، آلِ نوبخت اور آلِ بویہ کے افراد میرے دیکھے بھالے ہیں۔ ابوالسرایا بساسیریؔ، فاطمی امام مستنصر باللہ، ابنِ کلس بدر الجمالی اور ابنِ علقمی میرے لیے کئی صدی پہلے کے لوگ نہیں تھے، میرے لڑکپن کے لوگ ہیں۔ میں

نے انھیں بولتے چالتے چلتے پھرتے دیکھا ہے۔'' یہ ہے وہ جون ایلیا جس کے بارے میں لکھنا جس کی فکر کی تہیں کھولنا ان کو ہو بہو دنیا کو دکھانا آسان نہیں۔ شاید یہ ان کے اسی علم کی ہیبت ہے کہ اردو دنیا میں ان کے نام پر ایک بامعنی سناٹا طاری ہے۔ جون ایلیا کے فن کے مداح لاتعداد ہیں، بے شمار ہیں مگر اس فن پر گفتگو اگر ہوئی بھی ہے تو اچٹتی سی اور نہ ہونے کے برابر جس پر حیرت ہے۔ اسی حیرت کا اظہار محترمہ عنبرین جاوید صاحبہ نے کیا ہے جو کہ شاید کسی رسالے کی مدیرہ ہیں۔ وہ ایک ورق میرے پاس محفوظ ہے جس میں انھوں نے قدآورانِ ادب کی چشم پوشی، ناقدری اور بددیانتی کا نوحہ بھی کیا ہے اور اپنے معاشرے کی زوال پذیر سوچ اور پسند کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ وہ ایک مختصر تعزیتی مضمون ہے جس کا عنوان ہے، ''جون ایلیا کون ہے؟'' جس میں ان کا بیان ہے کہ جون ایلیا کے لیے خصوصی ایڈیشن چھاپنے کو انھیں ایک بھی مضمون نہیں ملا۔

یہ بات بعید از قیاس ہے کہ جون ایلیاؔ پر ایک بھی مضمون نہ مل سکے۔ جون ایلیا کے فن کو سمجھنے والوں کی کمی نہیں مگر کسی رسالے کے یا کی ایڈیٹر کے پاس وہ دلی لگن اور جذبہ موجود ہو جو کسی ادیب یا شاعر کی اصل قدر و قیمت کی شناخت کرانے کی ذمہ داری پوری کرنا جانتا ہو تو مضامین کے انبار لگائے جا سکتے ہیں۔ جون ایلیاؔ نے اپنے لیے خود کچھ نہیں کیا، اس کی دو وجوہات تھیں — ایک تو ان کا اپنا یہ بیان کہ '' کچھ میں دکان دکان جا کر اپنی حیثیت زائل کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔'' ان کی اس سمجھ بوجھ کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ کون سے ''ذاتی مراسم'' اور ادبی افراتفری کے دور میں جی رہے ہیں۔ دوسرے اس حساس شاعر کا وہ غم جس کے سبب ساٹھ سال کی عمر تک وہ اپنی کتاب شائع کرنے پر تیار نہیں ہوا، سنیے اس غم کی داستان۔

''موسم سرما کی ایک سہ پہر تھی، میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ بابا مجھے شمالی کمرے میں لے گئے۔ نہ جانے کیوں وہ بہت اداس تھے۔ میں بھی اداس ہو گیا۔ وہ مغربی کھڑکی

کے برابر کھڑے ہو کر مجھ سے کہنے لگے، 'تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔' میں نے پوچھا، 'کیا۔ بتائیے بابا کیا وعدہ؟' انھوں نے کہا، 'یہ کہ تم بڑے ہو کر میری کتابیں ضرور چھاپو گے۔' میں نے کہا، 'بابا میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو آپ کی کتابیں ضرور چھپواؤں گا۔'

مگر میں بابا سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کرسکا، میں بڑا نہیں ہوسکا۔ میرے بابا کی تصنیفات ضائع ہوگئیں۔ بس چند متفرق مسودے رہ گئے ہیں۔ یہی وہ احساسِ جرم ہے جس کے سبب میں اپنے کلام کی اشاعت سے گریزاں ہی نہیں متنفر رہا ہوں۔''

جون ایلیا کون ہے؟

یہ شکوہ یا دکھ یا حیرت یا سوال جو کسی ادبی جریدے کی ایڈیٹر کا پیش لفظ ہے، یہ ان کی کاوشوں کو بھی جہاں اسی عنوان کی لپیٹ میں لے لیتا ہے، وہیں یہ اہم سوال وقت کا بھی شاعروں، ادیبوں، تنقید نگاروں کے اژدہام سے ہے...اس غم کو، اس چشم پوشی کو اور اس سوال کو اپنی زندگی میں ہی جون ایلیا نے بڑے دل دوز انداز میں رقم کر دیا تھا:

کیا مری فصل ہو چکی؟ کیا مرے دن گزر گئے؟

یہ ایک مصرع نہیں، جون ایلیا کے مداحوں کے دلوں کی ہُوک ہے اور یہی مجھ سے میری کنکر بھر بساط کو کائی لگے تالاب میں پھینکنے کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔

جون ایلیا کے مضامین کے موضوعات کی وسعت و بیکرانی اور اسلوب کی رنگارنگی، ان کی شاعری کا منفرد لہجہ، اس لہجے کی گہرائی جون ایلیا کے فن پر تفصیلی گفتگو کا تقاضا کرتی، مگر اب وہ دور نہیں رہا، جب فن کے قدر دان ہوا کرتے تھے۔ اب کچھ اور ہی تماشے ہیں۔ ایک منحنی سی شاعری پر ڈھائی سو صفحات کی کتاب اور کئی درجن مضامین کے بارے میں بہت معتبر بہت مشہور ادیب نے بتایا کہ ''فی مضمون پانچ ہزار دیے گئے ہیں۔'' اوّل تو ممکن نہیں لیکن اگر ایسا ہوا کہ یہ مضمون ان کی نظر سے گزرا جن مشہور

ادیب کا میں نے حوالہ دیا ہے تو شاید ان کے اندر موجود گدھ اس بات کو برسرِ عام کہنے پر مجبور کر دے۔ ان تماشوں کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب جانتے ہیں اور سب دیکھ رہے ہیں۔ اور سب خاموش ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

ایسے میں جون ایلیا جیسے شاعر کو تو رائگاں جانا ہی تھا جسے پتا ہی نہیں تھا کہ کتنے برس مقتدر ادبی شخصیات کی چاکری کرنی پڑتی ہے کسی سند اور کسی افتخار کی مہر اپنے نام کے ساتھ لگوانے کے لیے۔ جون ایلیا کے لہو میں پشت ہا پشت کی اعلیٰ روایات کی وہ گونج تھی کہ وہ اپنے آپ سے تو دربدر ہو سکتے تھے مگر شہرت کا کاسہ لیے کسی ادب کے امیر و وزیر کے در پر حاضری لگوانا ان کے بس کی بات تھی ہی نہیں— سو جونؔ رائگاں گئے، اس رائگانی پر انھوں نے صبر کیا اور اپنے صبر کو تصویر کیا، اس تصویر کو شاعری کیا— کہ انھیں اتنا ہی آتا تھا:

یہ عہد وہ ہے کہ دانش ورانِ عہد پہ بھی
منافقت کی شبیہوں کا خوف طاری ہے
نمازِ خوف کے دن ہیں کہ ان دنوں یارو!
قلندروں پہ فقیہوں کا خوف طاری ہے

جون ایلیا کے چاہنے والے، ان کے فن کے حضور دو زانو ہونے، ان کی شاعری کی تلاوت کرنے والے، ان کی نثر کے ہر لفظ پر رقص کرنے والے لاتعداد ہیں، وہ چپ نہیں رہیں گے۔ وہ جون کے لکھے ہر لفظ پر انگلی رکھ رکھ کے پڑھائیں گے، اونچی اونچی آواز میں سنائیں گے، اس بے حسی کو اس سناٹے کے جو ان کے نام پر طاری ہے۔ جون ایلیا صرف شاعری کا ہی ایک بہت بڑا نام نہیں ہیں، ان کی نثری تخلیقات، ان کے فلسفیانہ مضامین، ان کی منطق کے حوالے سے عالمانہ گفتگو، ان کی تنقیدی بصیرت جس

مقام سے مخاطب کرتی ہے، وہ ششدر کر دیتی ہے ان کے قاری کو۔ مجھے اس مضمون میں ان کے قلم کے اس جوہر کے صرف چند نمونے پیش کرنے ہیں کہ ان کی پہچان صرف شاعری تک محدود ہے۔ اس مضمون میں جو تفصیلات آنی چاہیے تھیں وہ اس کو کتابی شکل دینے کے موقع پر پیش کروں گی۔ جون ایلیا کی نثری تخلیقات جن کی تفصیل ان کے مجموعے ''شاید'' پر درج ہے، اس حوالے سے ان کے بہت قریبی دوست سے جب میں نے سوال کیا کہ یہ کتابیں کیا کہیں دستیاب ہیں؟ تو وہ مسکرائے، ''یہ کتابیں ان کے خواب ہیں۔'' جون ایلیا سے جو واقف ہیں، وہ اس بات سے بھی بہت اچھی طرح واقف ہیں کہ جون کا علم اپنی شہرت کے لیے کسی جھوٹ کا محتاج نہیں تھا۔ جونؔ ہرگز ہرگز کتابوں کے تصوراتی نام شائع کرنے کی اجازت دے نہیں دے سکتے تھے۔ یہ درست ہے کہ جون ڈرامے کے ایک منجھے ہوئے اداکار تھے، لہٰذا دنیا کے اسٹیج پر بھی جب جی چاہے اداکاری کے خوب خوب جوہر دکھاتے تھے مگر علم کے سمندر میں کنارے پر پاؤں بھگو کے اور چند لہروں میں بھیگ کے خود کو تیراک اور غوطہ خور ثابت کرنے والوں میں نہیں تھے کہ ان کا تو بچپن ہی اس سمندر کی موجوں کے ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔ ان کے بچپن کے ہاتھ میں پتنگ کی ڈور کے بجائے منطق کی ڈور تھی، ان کی جوانی عہدِ عتیق، بابل و نینوا اور تاریخ کے کھنڈرات کی پرتیں الٹتے اور ان کھنڈرات کو پڑھتے گزری۔ دنیا بھر کی زبانوں کو انھوں نے سیکھا نہیں بلکہ انھیں اپنی رفاقت میں لے لیا۔ عربی اور فارسی سے عاشقی کی، عبرانی اور انگریزی سے یارانہ گانٹھا اور اردو کو مسند و تکیہ کیا۔ ان کے عشق کی دیمک نے ان کے وجود کو چاٹ لیا تو وہ خود سے لاتعلق ضرور ہو گئے مگر وہ اس عالم سے کیسے لاتعلق ہو سکتے تھے جو ان کی بھری پری شاداب کم سنی سے لے کر لہلہاتے ہوئے افکار کی جوانی اور پھر ان کے اطراف کی اور ان کے اندر کی بے کراں تنہائیوں میں ان کا غم گسار تھا۔ وہ اپنی محویت میں گم اس ہمزاد سے محوِ کلام رہتے تھے۔

جون ایلیا کا خود سے لاپروا اور لاتعلق طریقِ زندگی لوگوں کو جو بھی رائے قائم کرنے پر مجبور کرتا ہو مگر وہ جانتے تھے کہ کون سے عالَم میں رکھتا تھا، ان کے اندر کا عالم انھیں، تبھی تو کہا تھا انھوں نے:

میں بے ہوشی میں بھی بے ماجرا ہیں

یہ وہ جون ایلیا ہیں جن کو میں نے تھوڑا سا جانا مگر جو اُن کو بہت جانتے ہیں، وہ گواہی دیں گے کہ جب بات علمی لہجے میں ہو رہی ہو تو لسانیات کی ہو، تاریخ کی ہو، منطق کی ہو، شاعری کی ہو، قواعدِ شاعری کی ہو یا اردو، فارسی اور عربی کے کلاسیکی شعرا کی، وہ پورے ثبوت کے ساتھ بے تکان بولتے تھے اور اس تصدیق کے ساتھ گفتگو کرتے کہ بڑے بڑے نام ور ادیب ششدر رہ جاتے تھے۔ جون ایلیا سے بھی کبھی ان کی تصنیفات و تراجم مسیح بغداد، حلاج مطالعۂ طواسین، مسائلِ تجرید، رسائل اخوان الصفا، اخبار الحلاج، اسماعیلیت شام و عراق میں، اسماعیلیت جزیرۂ عرب میں، اسماعیلیت یمن میں، حسن بن صباح کے حوالے سے بات نہیں ہوسکی کہ ان سے ملاقاتیں ہمیشہ ان کی دو شخصیتوں سے ملاقات پر مبنی ہوتی تھیں۔ ایک وہ جون ایلیا جو اپنی بہت گہری خامشی اور بے تحاشا بے دلی کے صحراؤں میں ٹھوکریں کھاتے خود سے یوں دور نکل جاتے تھے کہ اپنے اردگرد کا انھیں ہوش ہی نہیں ہوتا۔ ایسے میں انھیں مخاطب کرنا بہت مشکل ہوتا تھا یا پھر وہ جون ایلیا جو گفتگو کر رہے ہوتے تو اپنے مخاطب کو جیسے کوئی نشہ آور مشروب انڈیل انڈیل کے دیے چلے جاتے کہ ان کی گفتگو میں دھت ہو کے سوال جواب کی سدھ بدھ ہی نہیں رہتی تھی۔ لہٰذا ''شاید'' پر دی گئی کتابوں کی فہرست صرف ان کا خواب تھی، نے مجھے عجب سی بے چینی میں بھی مبتلا رکھا اور میری کھوج کو بھی مہمیز کیا کہ میں ان کتابوں کے حوالے کہیں تلاش کروں اس سلسلے میں میری اس کھوج کو جناب خرم علی شفیق کا ۳ر جنوری ۱۹۹۵ء کا ''ڈان'' اخبار کا ایک مضمون خوش آیا۔

خرم علی شفیق کے مضمون سے جون ایلیا کی ان تصنیفات اور تراجم کا کچھ سراغ ملتا ہے جو انھوں نے اسلامی تاریخ اور فلاسفی کے تراجم و تحقیق کے حوالے اسماعیلی ورلڈ اسلامک سینٹر میں انجام دیا۔ خرم علی شفیق نے جون ایلیا سے اپنے مکالمے کی جو تفصیل لکھی ہے، وہ جونؔ کے مفکرانہ خیالات کی نشاندہی کرتی ہے۔

جونؔ کہتے ہیں:

''میں (ورلڈ اسماعیلی) سینٹر میں اسلامی تاریخ اور فلسفے پر کام کرتا تھا۔ میں نے اخوان الصفا کی خفیہ تنظیم کے مرتب کردہ انسائیکلو پیڈیا کی باون جلدوں کا اردو ترجمہ کرنے کی پیش کش کی۔ اس انسائیکلو پیڈیا نے روسو اور والٹیئر جیسے انقلابی مفکرین کے ساتھ ساتھ اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا اور لغت نگاروں کو تحریک دی۔

دراصل ان باون جلدوں میں علم الاعداد اور ریاضی سے لے کے علم نجوم، موسیقی اور پراسرار علوم تک بہت سے متنوع موضوعات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ میں اس انسائیکلو پیڈیا کی بیس جلدوں کا ترجمہ کر چکا تھا... انیس سو ساٹھ کے اواخر میں اسماعیلی سینٹر، کراچی سے لندن منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح یہ پروجیکٹ نامکمل رہ گیا اور اس کے بعد میرے ترجمے کے مخطوطات کی پانچ جلدوں کے علاوہ باقی گم ہو گئیں۔''

خرم علی شفیق نے اسی حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کے مطالعے کا ایک اور اہم موضوع حلاج تھا۔ حلاج مسلمانوں کے دورِ حکومت کی تیسری صدی کے صوفی شہید تھے۔ حلاج کے اس مطالعے میں اٹھارہ سال کے عرصے اور تین سو سے زیادہ ماخذوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اشک آمیز آنکھوں کے ساتھ انھوں نے بتایا کہ ان کی محنت کا ثمر یعنی حلاج کے مخطوطات ان کی ذاتی زندگی کے حوادث کی نذر ہو گئے۔ سو، یہ ہوا کہ جون ایلیا نے اسلامک سینٹر میں تصنیف و تالیف کا جو کام کیا، جو محنت کی، جو وقت لگایا اور جن بیس جلدوں پر انسائیکلو پیڈیا کے کام کیا، وہ

زیادہ لندن کے اسلامک سینٹر کی ملکیت ہے جو پانچ جلدیں انھوں نے محفوظ کی تھیں ذاتی کام کی، اس میں سے شاید دو ایک محفوظ ہوں مگر باقی کا کوئی پتا نہیں عوام کو۔ شاید ان کے قریبی دوستوں کو اس کا کچھ علم ہو۔"

حقی صاحب نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ کمپیوٹر پر محفوظ کی ہوئی، ان کی ایک فائل کسی طرح ڈیلیٹ ہوگئی تو پورا ہفتہ وہ سو نہیں سکے تھے صدمے سے۔ جون ایلیا کی تو برس ہا برس کی محنت کا ثمر تھا ان کا وہ کام— یہ نقصان صرف جون ایلیا کا نہیں بلکہ اردو ادب کا وہ نقصان ہے جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ ان کئی ہزار صفحات میں جون ایلیا نے اپنی فلسفیانہ فکر، اپنے جداگانہ طرز نگارش، اپنے استدلال اور عربی اور فارسی پر اپنی دسترس کے کیا کیا جوہر دکھائے ہوں گے، افسوس کہ وہ شاید ضائع ہوگئے یا شاید کسی غیر محفوظ فائل میں محفوظ ہوگئے۔ اس کا کھوج لگانا اب مشکل ہے مگر ہمارے پاس ''شاید'' کے پیش لفظ کی صورت میں جو ۳۰ صفحات ہیں، یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں کہ وہ کئی ہزار صفحات کیسے نادر، کیسے قیمتی اور کتنے انمول ہوں گے۔ ''شاید'' کے دیباچے کے حوالے سے معروف شاعر فرحت شہزاد سے بات ہو رہی تھی تو انھوں نے بے ساختہ کہا، ''شاید'' ایک کتاب نہیں ہے، یہ جون ایلیا کی دو کتابیں ہیں۔'' اور یہ بات جس جس نے ''شاید'' کا دیباچہ پڑھا ہے، اس کے دل کو لگے گی کہ یہ تیس صفحات دراصل کوزے میں سمندر کی حقیقی مثال ہیں۔ اس کی ہر سطر، اس کا ہر بیان ان کے علم کی گہرائی کا وہ ثبوت ہے جس کی نظیر نہیں۔ جون ایلیا کی شاعری ہو یا ان کا کوئی نثر پارہ، ان کی زبان میں ایسا تغزل ہے، ایسا والہانہ پن ہے وہ معنی آفرینی ہے، فکر و خیال کی وہ رفعتیں ہیں، زبان کو برتنے کا وہ ہنر اور ایسا سلیقہ ہے کہ ان کا کہا ان کے ہی لہجے کی سند بن گیا ہے۔

اپنے تعارف کا یہ انداز دیکھیے:

''میں دوآبۂ گنگ و جمن کے حالت خیز، رمزیت آمیز اور دل انگیز شہر امروہہ

میں پیدا ہوا۔"

اپنے امروہہ کے گھر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وہ ایک مشرق رویہ مکان تھا۔ اس کا طرہ دالان آخرِ شب سے آفتاب کا مراقبہ کرتا تھا۔ اس مکان میں رات دن روشنیِ طبع اور روشنائی کی روشنی پھیلی رہتی تھی۔"

اسی روشنیِ طبع اور روشنائی کی روشنی نے جون ایلیا کے بچپن کی آبیاری کی۔

"جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر میں صبح سے شام تک شاعری، تاریخ، مذاہبِ عالم، جدید علمِ ہیئت اور فلسفے کا دفتر کھلا دیکھا اور بحث مباحثہ کا ہنگامہ گرم پایا۔ اس تمام سرگری کا مرکز ہمارے بابا علامہ سید شفیق حسن ایلیا تھے۔ وہ کئی علوم کے جامع تھے اور کئی زبانیں جانتے تھے۔ یعنی عربی، انگریزی، فارسی، عبرانی اور سنسکرت۔ وہ قلم ہی نہیں، موقلم کے بھی آدمی تھے۔ دانتے کے بعد بابا شاید پہلے آدمی تھے جنھوں نے کائنات کی نواحی اور ضواحی سے معاملت رکھنے کا فنی ثبوت مہیا کیا تھا۔ انھوں نے جنت اور جہنم کا ایک نقشہ بنایا تھا۔ اس نقشے میں انھوں نے اپنے وجود کے باطنِ باطن اور کامنِ کامن کے جلال و جمال کو کمالِ احساس آگینی کے ساتھ پیش کیا تھا۔

انھوں نے جنت میں اپنی ذاتِ ذات اور صفاتِ صفات کے تمام روف اور عطوف رنگ کھپا دیے تھے۔ اب رہا جہنم، تو اس میں انھوں نے بے حد جارحانہ، سفاکانہ اور بینائی سوز رنگ استعمال کیے۔ ان کے تمام جاننے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے زندگی میں ایک بار بھی غصہ نہیں کیا مگر میرا خیال ہے کہ انھوں نے زندگی میں ایک بار ضرور غصہ کیا تھا، یہ جہنم ان کا غصہ تھا۔"

اس بیان کے بعد جون ایلیا کے دوسطری بیان کو پڑھیں اور اس بے پناہ شاعرو نثر نگار، ماہرِ لسانیات وفلسفی کے داخلی کرب کا اندازہ لگائیں:

"یہ دو بعدی جہنم ان کے ارتیابی، لاادری اور زندیق بیٹے جون ایلیا کے حق

میں سہ بعدی ہو گیا ہے اور وہ اس جہنم کے درکِ اسفل میں جل رہا ہے، بھڑک رہا ہے، دہک رہا ہے مگر راکھ نہیں ہوتا۔"

یہ آگ کون سی تھی جس میں وہ جل رہے تھے؟

یہ آگ صرف ان کے ناکام عشق کی آگ نہیں تھی، یہ صرف ایک عورت سے جدائی کا جہنم نہیں تھا — اس سے انکار نہیں کہ ان کے آخری دنوں میں اس ناکام عشق کی وحشت ان کی روح کو دھجی دھجی کر کے ان میں ہر طرف اچھالتی رہتی تھی مگر ان کے اندر جو شعلے بھڑک رہے تھے اس کی نشان دہی تو ان کی ابتدائی تحریروں سے ہی ہو جاتی ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ یہ آگہی کا جہنم تھا۔ یہ علم کی آگ تھی، یہ ان کی سیاسی بصیرت کی تپک تھی، یہ طبقاتی تفریق کے دہکتے ہوئے الاؤ تھے، ان کے سینے میں جس میں خود کو وہ چاروں طرف سے گھرا ہوا اور بے بس و مجبور پاتے تھے، سنیے جون ایلیا کے الفاظ میں کہ وہ کس جہنم میں آگہی کے جل رہے ہیں:

☆ ہماری قوم کے بڑوں نے راستی کو بھلا دیا اور جھگڑوں کو اس کی حدوں سے آگے بڑھا دیا۔

☆ ہمارے خواب اور ہماری خواہشیں، اقتدار کے سموں سے روندی گئیں اور ہماری خوشیاں حبِ جاہ کی چکی میں باریک پیسی گئیں۔

☆ ہمارے ایوانوں میں دانائی ترک ہوئی اور فراست پسپا۔

☆ ہم مصیبت کے ٹاٹ پر بیٹھے اور پشیمانی کی خاک ہم نے اپنے سروں پر ڈالی۔

☆ اپنے بڑوں کی طرف ہم نے دیکھا اور چاہا کہ وہ اپنی پر نخوت انا کے زرہ بکتر اتاریں اور عجز و انکساری کا لبادہ پہنیں۔

☆ ہم نے چاہا کہ وہ حاکمیت کے چوک میں کھڑے ہوں تو ان کے ہاتھوں میں انسان پرستی اور خرد دوستی کا نصاب ہو اور آنکھوں میں عدل اور انصاف کے خواب۔

☆ وائے ہو ان پر جنھوں نے ہماری خواہشوں کو ببول کے کانٹوں پر بچھایا اور ہمارے خوابوں کو خزاں کے سپرد کیا۔

☆ وائے ہو ان پر جنھوں نے بردباری کا ذخیرہ دریا برد کیا اور تحمل کے کھلیان کو آگ لگائی۔

☆ ایسا کیوں ہوا لوگو کہ تم پر وہ مسلط کیے گئے... جو کیے گئے؟

☆ یاد کرو لوگو! کہ تاریخ محکوموں کے اعمال کے مطابق ہی ان کے حاکم منتخب کرتی ہے۔

☆ اے لوگو! زمانہ ان ہی سے منہ پھیرتا ہے جو خود سے منہ پھیریں۔

☆ تاریخ... قوموں اور گروہوں کو ان کے حق سے کم کرتی ہے اور نہ زیادہ۔

☆ جغرافیہ... ان ہی سے روٹھتا ہے جو اپنے دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں، کھیتوں، کھلیانوں، بستیوں، باغوں اور باغیچوں کی نگہداری نہیں کرتے۔ ہم نے جھوٹ کی بیساکھی سے دنیا میں اپنا قامت بڑھانے کی کوشش کی اور منہ کے بل گرے۔

☆ ہم نے اپنے جغرافیہ کو مالِ غنیمت جانا اور اس سے محض سمیٹنے کو اپنا حق سمجھا۔ آج ہم اپنے حال پر زار و قطار روتے ہیں اور اپنی بدبختی کی ذمے داری کبھی تاریخ، کبھی جغرافیہ، کبھی دوستوں اور کبھی دشمنوں کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔

☆ حقائق کا آئینہ ہمارے سامنے ہے لیکن ہم اس کے روبرو نہیں ہوتے، ہم کبھی اپنی تاریخ میں قریب اور بعید کی غلطیوں پر نظر تو کریں، کبھی اپنے جغرافیہ سے پوچھیں تو سہی کہ اس نے ہمارے ہاتھوں کتنے زخم اٹھائے ہیں۔

☆ ہم... جنھیں دوسروں سے حساب فہمی کا عارضہ ہے، ہم کبھی اپنا حساب بھی دیں، کبھی اپنے نامۂ اعمال پر ایک نظر تو ڈالیں، تب ہی ہم اس کے اہل ٹھہریں گے کہ اپنے نادان اور ناعاقبت اندیش بڑوں سے کہہ سکیں کہ انھوں نے راستی کو بھلا دیا اور جھگڑے کو اس کی حدوں سے آگے بڑھا دیا۔

لیکن عزیزو! پھر اس کی نوبت ہی کیوں آئے گی؟

تم حیران و سرگرداں ہو میرے اس جملے پر...!

شاید تمھیں یاد نہیں رہا، ابھی چند ساعتوں پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ تاریخ محکوموں کے اعمال کے مطابق ہی ان کے حاکم مقرر کرتی ہے!

کیا واقعی، تم اب بھی نہیں سمجھے کہ میں تمھیں کیا سمجھا رہا ہوں؟

جون ایلیا کے ''انشا'' میں چھپنے والے بے شمار مضامین سے یہ صرف ایک مضمون ہے، یہ ان کی بے کنار فکر کی صرف ایک موج کی نشان دہی ہے۔ یہ ان کی انشا پردازی کا صرف ایک ورق ہے، یہ ان کی فلسفیانہ فکر کی صرف ایک جھلک ہے اور یہ ان کے سیاسی شعور اور تاریخ و جغرافیہ سے واقفیت کی صرف ایک مثال ہے۔

جون ایلیا نے ادب، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ جس موضوع کو بھی چھوا، اس کو سرسری طور پر بیان نہیں کیا۔ دوسروں کی تحریر سے بڑے بڑے مفکرین کے حوالہ جات اکٹھا کر کے اپنے قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ پورے وثوق کے ساتھ اپنے علم اپنی تحقیق اور اپنے دلائل کے ساتھ بیان کیا۔ خدا اور کائنات منطقی قیاس کی گرفت میں پوری طرح کبھی بھی نہیں آسکے۔ مذہب اور خدا عقل کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہے، فلسفی شاعر جون ایلیا نے اس بات کو اثبات کیا ہے مگر اپنے دلائل کے ساتھ اور اپنے لفظوں میں انھوں نے اپنی نثری تخلیقات میں اس موضوع پر کھل کے گفتگو کی ہے، وہ کہتے ہیں:

''میں اپنی شدید ارتیابیت کے باوجود یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کرۂ ارض بلکہ ہماری اس کہکشاں کے کسی بھی سیارے پر کسی ایسے ذہن کا وجود فرض کرنا ممکن نہیں جو لفظ 'خدا' کے مفہوم کی تشریح کر سکے۔''

جون ایلیا اس موضوع پر بیکن، کانٹ اور پلوٹی نس کے منطقی استدلال کو پیش کرتے ہوئے اپنے مطالعے کا دبدبہ قاری کے دل پر نہیں بٹھاتے بلکہ ذاتی استدلال سے

ثابت کرتے ہیں کہ کتنا افادہ کیا ہے انھوں نے ان فلسفیانہ افکار سے، وہ کہتے ہیں:

''میں حلاج کے خطبات کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔ موجود کا مطلب ہے، ارسطو کے دس مقولات، کانٹ کے بارہ مقولات، اور ہیگل کے (شاید) سترہ مقولات میں محدود ہو جانا۔ دنیا کے کسی فلسفی نے میرے علم کے مطابق آج تک وجود اور موجود کی تعریف کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ ہم لغوی اور نصابی طور پر وجود کی ایک ہی تعریف کر سکتے ہیں اور وہ ہے ماہیت کا خارج میں پایا جانا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے تو ہم اسے ایک ماہیت قرار دیتے ہیں۔ ہر موجود شے ہے۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا شے ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب نہیں تو پھر اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خدا لاشے ہے۔ لاشے کے دو مفہوم ہوتے ہیں، ایک لامحدود اور یہ کہ وہ شے موجود نہ ہو... کچھ اور ہو۔ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب مابعد الطبیعی فکر کے تمام نمائندوں کو دینا ہے۔ فلسفہ وجود اور وجودیت سے بحث کرتا ہے اور سائنس مظاہرِ وجود سے بحث کرتی ہے۔''

منطق سے جڑے ہوئے مابعد الطبیعیات، سائنس اور شاعری کے باب میں جون ایلیا کا فرمان دیکھیے، ''منطق جب استاج اور استخاج کے متدرج عمل میں غیر متدرج ہو جائے تو مابعد الطبیعیات وجود میں آتی ہے۔ منطق جب استاج اور استخاج کے استخراجی اور استقرائی عمل میں متدرج رہے تو سائنس وجود میں آتی ہے۔ اور منطق جب احساس کی مکانیت اور زمانیت میں تخیل اور جذبے کے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ صورت پذیر ہو تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ یعنی شاعری کے چار عناصر ہیں: تعقل، احساس، تخیل اور جذبہ۔ جب کہ سائنس بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر صرف احساس سے تعلق رکھتی ہے۔ مذہب تخیل سے تعلق رکھتا ہے۔ فلسفہ صرف تعقل سے تعلق رکھتا ہے اور شاعری احساس، تخیل، تعقل اور جذبے چاروں عناصر کی جامع ہے۔''

میں نے گفتگو کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ جون نے منطق ہو یا ادب، سائنس ہو یا شاعری اور اس کے قواعد وضوابط، جس موضوع پر بھی بات کی ہے ٹھوس دلائل کے ساتھ بات کی اور یوں کہ کوزے میں سمندر اور حباب میں دریا دکھا دیا ہے۔ جون کی گفتگو کو اپنے الفاظ میں ڈھال کے بیان کرنے کے بجائے میں بار بار انھیں کوٹ کرنے پر مجبور ہوں تا کہ اپنی کہی ہوئی بات ثابت کرسکوں۔ جون نے شاعری کو جزوِ پیغمبری نہیں مکمل پیغمبری کہا ہے۔

''شاعری میرے ماحول میں جزوِ پیغمبری نہیں بلکہ مکمل پیغمبری سمجھی جاتی تھی۔ وہ بابا کی زبان میں ایک اُلوہی آہنگ، قدوسی ترتیل اور قدیسی ترنیم کی حیثیت رکھتی تھی۔''

''شعر کو عربی لفظ سمجھا جاتا ہے اور اسے شعور کا مادہ قرار دیا جاتا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ شعر عبرانی لفظ 'شیر' کا معرب ہے۔ اس کے معنے ہیں: راگ، خوش آوازی اور خوش آہنگی۔ میرے خیال میں وزن شعر کی بنیادی شرط ہے۔ جب ہم مکالماتِ افلاطون یا نطشے کی تحریروں کی داد دیتے ہیں تو انھیں شاعری کہہ اٹھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک چیز ہے تحسین اور ایک چیز اصطلاح۔ ہمیں ان دو چیزوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ ہم افلاطون، قیس ابن ساعدہ، سعدی، آسکر وائلڈ اور میر امّن کو بہترین شاعر کہہ کر یاد نہیں کریں گے بلکہ انھیں اعلیٰ ادیب کہیں گے۔''

نثری نظم کے حوالے سے طویل بحثیں ہو چکی ہیں اور ہنوز جاری ہیں۔ گو جون نے نثری نظم کے بحث مباحثے میں حصہ نہیں لیا لیکن اپنی ذمے داری محسوس کرتے ہوئے اس موضوع پر بھی جو کہا، اس سے انکار یا اختلاف کیسے ممکن ہے۔ ''شاید'' کا پیش لفظ لکھتے وقت جون کی ذہنی حالت ابتر تھی۔ انھیں روشنی سے، آوازوں سے اور لوگوں سے ڈر لگتا تھا، وہ کہتے ہیں، ''میرا دماغ دماغ نہیں، بھوبل ہے، آنکھیں ہیں کہ زخموں کی طرح ٹپکتی ہیں۔'' مگر ''میں اب بھی اپنے خواب نہیں ہارا ہوں۔ میری آنکھیں ٹپکتی ہیں مگر

میرے خوابوں کے خنک چشمے کی لہریں اب بھی میری پلکوں کو چھوتی ہیں۔"

اللہ اللہ! یہ جون کا پیش لفظ اس عالم کا لکھا ہوا ہے... ایسی اذیت ناک کیفیت دل و دماغ کی، ایسی بے دلی... اس عالم یاس میں بھی جب قلم اٹھاتے ہیں تو علم کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے ان کی تحریر میں۔ ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا، سوائے خوابوں کے۔ ان کے وجود کو اپنے سموں سے روندتی حقیقتیں ان کے خوابوں کو بھی ان کے ساتھ روند ڈالیں گی، انھیں معلوم تھا۔ ٹوٹے ہوئے، ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے، مایوسیوں کے گھپ اندھیرے میں خود پر تالے ڈالے ہوئے جون نے خود کو اِدھر اُدھر سے بٹورا اور... آخری بار اپنے ہر خیال کو، ہر سوچ کو، ہر خواب کو پوری سچائی کے ساتھ لکھ ڈالا۔ کسی سوچ نے دل کی ممکن ہے، آس دلائی ہو "شاید جون، شاید... اہلِ ادب تمھاری شناخت کو سینے سے لگالیں۔" ممکن ہے جون زیرِ لب ذرا سا مسکرا دیے ہوں، ایک لمحے کو امید کی کوئی کرن جھلملائی ہو اور سوچا ہو، "شاید" معلوم نہیں، اس "شاید" سے کتنی امیدیں وابستہ ہوگئی ہوں ان کی جب انھوں نے اسے اپنے مجموعے کے نام کے طور پر منتخب کیا ہوگا... مگر نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، عنبریں جاوید کو ان کی برسی کے موقع پر ایک بھی مضمون نہیں ملا... کیسے ملتا کہ یہاں تو "میں" کی اس قدر چیخ پکار ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی... میرا قامت، میری کتاب، میری کہا، میرا ایوارڈ، میرا گروپ۔ میں بڑا کہ تو بڑا، کی ایسی دھکم پیل ہے کہ اللہ کی پناہ! اس دھکم پیل میں جون ٹکر ٹکر دیکھ رہے ہیں سب کی طرف اور ان کی آواز شاید کہیں نوحہ کر رہی ہے:

میری ہر بات بے اثر ہی رہی
نقص ہے کچھ مرے بیان میں کیا؟
بولتے کیوں نہیں مرے حق میں
آبلے پڑ گئے زبان میں کیا؟

جون ایلیا فکری، ذہنی اور سماجی انقلاب کے خواب لکھتے رہے اور ان کی آنکھیں یہ خواب روتی رہیں، ان کی ناکام محبت بے دلی کے صحرا ان کے وجود میں بچھاتی رہی اور یہ صحرا ان کی خاک اڑاتا، اُن پر سے گزرتا گیا مگر بے دلی کے اس صحرا میں ان کے وجود کی نشانیاں قندیل کی طرح روشن ہیں۔ روشنیِ طبع اور روشنائی کی روشنی ان کے نام کے چراغ جلائے ہاتھ بلند کیے بادِ مخالف کے سامنے ڈٹی ہوئی ہے:

مصروف کوئی کاتبِ غیبی ہے روز و شب
کیا ہے بھلا نوشتۂ دیوار کچھ سنا؟

ہیں اس قامت سوا بھی کتنے قامت
پر اک حالت ہے جو اس کے سوا نئیں

ذرا بھی مجھ سے تم غافل نہ رہیو
میں بے ہوشی میں بھی بے ماجرا نئیں

جون ایلیا کو نادیدہ اُفق سے اٹھنے والے بادلوں کا انتظار تھا کہ وہ اس آبِ نیساں سے ان سمتوں، چھتنار پیڑوں اور پودوں کو دھونا چاہتے تھے جو تاریخ کی گرد افشانی سے گردآلود تھے۔ شاخوں کو ہواؤں اور شعلوں کو اور سب سے بڑھ کے اس دنیا کو دھونا چاہتے تھے۔ وہ یزداں، اہرمن اور انسان کو دھونا چاہتے تھے مگر یہ نہیں ہوسکا تو جون نے اپنے یہ آنسو آپ سب کے نام لکھ دیے... وہ سب جو اُن کی خواب کتاب لکھیں گے۔



نسیم سیّد کا ادبی سفر

آدھی گواہی (شاعری)

سمندر راستہ دے گا (شاعری)

شمالی امریکا کے مقامی باشندوں کی شاعری (شعری تراجم)

جون ایلیا — خوش گزراں گزر گئے (تنقید)

کہانیوں کی کہانیاں (زیرِ ترتیب افسانے)